(آرٹس اینڈ سائنس ری ویو)

گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج حافظ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اثــر

(آرٹس اینڈ سائنس ری ویو)

2020ء
شمارہ نمبر:۱

گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج حافظ آباد

فہرست

مضامین

شخصیات

نظم و غزل (اُردو و پنجابی)

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا

اداریہ

یہ امر باعث فخر و انبساط ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور محترم پرنسپل جناب پروفیسر الحاج محمد یونس جنجوعہ کی خصوصی دلچسپی اور مشفقانہ سرپرستی میں کالج کا میگزین ''اثر'' (آرٹس اینڈ سائنس رویو) آپ کے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کر رہا ہے۔ تعلیمی اداروں کی طرف سے شائع کیے جانے والے ادبی اور تخلیقی رسائل کا اجرا نوجوان نسل کے اذہان کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان رسائل میں موجود مضامین اور خیالات قوم کی سوچ اور پرواز کی نشاندہی کرتے ہیں۔

''اثر'' میں شامل تمام نگارشات کو خالص ادبی تحریریں کہنا مبالغہ ہوگا۔ مگر اتنا ضروری ہے کہ جس طرح مختلف رنگ کے پھولوں کو یکجا کر کے ایک خوبصورت گلدستہ تشکیل دیا جاتا ہے اسی طرح مجلّے میں شامل مختلف نوعیت کی تحریروں نے مل کر مشاطہ کا کام کیا ہے۔

ادب کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ ادب کا ارتقا مسلسل ہوتا رہتا ہے نیز ادب اور زندگی کا اتنا قریبی تعلق ہے کہ دونوں کے درمیان حد فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ اس مجلّہ میں کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ کے تحریر کردہ مواد کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے تا کہ ان کے ادبی ذوق کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ تنقید و تصحیح کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کی اصلاح ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

شرافت علی تاشف
ایڈیٹر (اُردو سیکشن)

پرنسپل پروفیسر الحاج محمد یونس جنجوعہ

وائس پرنسپل پروفیسر حافظ محمود سلیمان

پرچم کشائی تقریب 14 اگست 2020

میلاد اجتماع

یوم استحصال کشمیر 2020

شجرکاری مہم

سپورٹس گالا

افتتاحی تقریب سے پرنسپل صاحب کا خطاب

قومی ترانے کا احترام

کبڈی میچ

سائنس نمائش 2020

ڈینگی سرگرمیاں

حافظ آباد: پرنسپل گورنمنٹ کالج محمد یونس کی قیادت میں اساتذہ وطلباء انسداد ڈینگی واک میں شریک ہیں۔

(تفریحی ٹور وادی سونسکیسر)

وادی سونسکیسر پر وفیسر رائے عمران خان و پروفیسر محمد بلال

کانفرنس روم کا افتتاح

ننھے منے طلبا ہمراہ پرنسپل صاحب

پیغام

تعمیر وطن کے لیے تعلیمی اقدار کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ حصول علم زندگی کی اولین ترجیح ہونا چاہیے کیونکہ علم کے بغیر انسان میں انسانیت نہیں آ سکتی۔ انسان ماں کی گود سے لے کر لحد تک ہر لمحہ کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہے۔ علم کی اہمیت و افادیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

موجودہ دور میں تعلیم اور ہنر مندی کو کسی بھی قوم کی ترقی وخوشحالی کی ضمانت تصور کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا حسین امتزاج ایک طالب علم کی اس انداز سے تعلیمی تکمیل ہوتی ہے جس سے نہ صرف وہ خود کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ بلکہ اپنے معاشرے کی ترقی کا باعث بنتا ہے کیونکہ تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس میں ایک استاد طالب علم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اور علوم وفنون میں ماہر بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاق، شخصیت اور کردار کو بھی بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ یہی طالبعلم ملک کے معمار ہیں جن سے مستقبل میں ملک کی سلامتی اور ترقی کا دارومدار ہے۔

آج ہمارا سامنا ایک مبارزت ومقابلہ کی دنیا سے ہے اس مقابلے میں نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آج کا نوجوان طبقہ جدید علوم وفنون میں علم ومہارت سے بدرجہ احسن آراستہ ہو۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے طالب علم صلاحیتوں کے اعتبار سے کسی سے کم نہیں ہیں۔ انہیں صحیح سمت میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ دنیا کے ساتھ چلنے کے لیے تحقیق پر مبنی تعلیم سے طلبہ کو سنوارنا ہوگا۔ کسی بھی قوم کا مستقبل اس قوم کے نوجوان ہوتے ہیں اور نوجوان نسل اگر جہد مسلسل کو اپنا شعار بنا لے تو پھر اس قوم کو دنیا کی امامت اور رہنمائی سے کوئی نہیں روک سکتا۔

پروفیسر الحاج محمد یونس جنجوعہ
پرنسپل گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج
حافظ آباد

حمد باری تعالیٰ

جگرؔ مراد آبادی

تجھی سے ابتدا ہے، تو ہی اک دن انتہا ہو گا
صدائے ساز ہو گی اور نہ ساز بے صدا ہو گا

ہمیں معلوم ہے، ہم سے سنو، محشر میں کیا ہو گا
سب اُس کو دیکھتے ہوں گے، وہ ہم کو دیکھتا ہو گا

سر محشر ہم ایسے عاصیوں کا اور کیا ہو گا
درِ جنت نہ وا ہو گا، درِ رحمت تو وا ہو گا

جہنم ہو کہ جنت، جو بھی ہو گا فیصلہ ہو گا
یہ کیا کم ہے؟ ہمارا اور اُن کا سامنا ہو گا

ازل ہو یا ابد، دونوں اسیر زلف حضرت ہیں
جدھر نظریں اٹھاؤ گے، یہی اک سلسلہ ہو گا

یہ نسبت عشق کی بے رنگ لائے رہ نہیں سکتی
جو محبوب خدا کا ہے، وہ محبوب خدا ہو گا

اسی اُمید پر ہم طالبان درد جیتے ہیں
خوشا! دردے کہ تیرا درد، درد لادوا ہو گا

نگاہ قہر پر بھی جان و دل سب کھوئے بیٹھا ہے
نگاہِ مہر عاشق پر اگر ہو گی تو کیا ہو گا

یہ مانا! بھیج دے گا ہم کو محشر سے جہنم میں
مگر جو دل پہ گزرے گی، وہ دل ہی جانتا ہو گا

سمجھتا کیا ہے تو دیوانگان عشق کو، زاہد!
یہ ہو جائیں گے جس جانب، اُسی جانب خدا ہو گا

جگرؔ کا ہاتھ ہو گا حشر میں اور دامنِ حضرت ﷺ
شکایت ہو کہ شکوہ، جو بھی ہو گا برملا ہو گا

☆......☆

نعت شریف

حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ

زرحمت کُن نظر، بر حال زارم یا رسول اللہ
غریبم، بے نوایم، خاکسارم یا رسول اللہ
زِداغِ ہجرِ تو کے دل فگارم یا رسول اللہ
بہار صد چمن در سینہ دارم یا رسول اللہ
توئی تسکینِ دل ، آرام جاں، صبر و قرارِ مَن
رُخ پُر نور! جانِ بے قرارم یا رسول اللہ
توئی مولائے من، آقائے من، والی جانِ مَن
توئی دانی کہ جُز تو کس نہ دارم یا رسول اللہ
دمِ آخر نمائی جلوہ دیدار جامؔی را
زلطف تو ہمیں اُمید دارم یا رسول اللہ

☆ اے اللہ کے رسول ﷺ میری تباہ حالی پر، کرم کی نظر فرمائیں۔ کہ میں غریب ہوں، بے آسرا ہوں اور خاک نشین ہوں۔ ☆ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ کی فرقت کے داغ سے میرا دل کیسا ریزہ ریزہ ہوا ہے کہ سینکڑوں گلشنوں کی بہاروں کا تصور دل میں لیے ہوئے ہوں۔☆ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ ﷺ ہی کی ذاتِ گرامی دل کا سکون، روح کا چین اور میرا صبر اور دل کی ڈھارس ہے۔ آپ کا نور سے بھر پور چہرہ میری بے قرار روح کا چین ہے۔ ☆ آپ ہی میرے آقا، میرے سر پرست اور میری جان کے مالک ہیں، آپ ﷺ جانتے ہیں کہ آپ کے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے۔☆ آخر وقت جامؔی کو اپنے دیدار کا جلوہ دکھا دیجئے۔ آپ ﷺ کی مہربانی سے اے اللہ کے رسولؐ میں یہی توقع رکھتا ہوں۔

☆......☆

سالانہ سپورٹس گالا

پرنسپل کا خطا ( )

میرے قابل احترام پروفیسرز اور عزیز طلبا!

سالانہ سپورٹس گالا کسی بھی تعلیمی ادارے خواہ وہ پرائمری سکول ہو، ہائی سکول ہو، کالج یا یونیورسٹی ہو۔ میں منعقد ہونے والے تمام ایونٹس میں سب سے زیادہ جاندار اور شاندار ایونٹ ہوتا ہے اور ادارے کے تمام اساتذہ اور طلبا سارا سال اس ایونٹ کا بے تابی سے انتظار کرتے ہیں۔

عزیز طلبا!

کھیل جسمانی صحت کے لیے ایک لازمی مشغلہ ہیں جس طرح بغیر کھائے پیئے زندہ رہنا مشکل ہے اسی طرح بغیر کھیل کے صحت کا بحال رکھنا محال ہے۔ ایک انگریزی مقولے کے مطابق دماغ بھی اس کا صحت مند ہوتا ہے۔ جس کا جسم مضبوط اور توانا ہو۔

"A sound mind is in a sound body."

اگر جسم اور دماغ صحت مند نہ ہو تو زندگی بے کار ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کھیل ہماری زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہی قومیں دنیا میں طاقت ور شمار ہوتی ہیں جنہوں نے کھیل کود کو تعلیم کا اہم جزو بنایا ہے۔ زمانہ قدیم سے دنیا کے ہر خطے میں، ہر حصے میں، ہر عمر، ہر جنس اور ہر طبقے کے افراد عمر کے کسی بھی حصے میں انفرادی یا اجتماعی طور پر کسی نہ کسی کھیل میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ قدیم یونان جس نے سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسی عظیم الشان ہستیاں پیدا کیں کہ جن کے کارنامے قیامت تک مٹنے والے نہیں، ان کے یہاں یہ عالم تھا کہ کھلاڑی کئی کئی سال درسگاہوں میں مشق کیا کرتے اور مقررہ وقت کے بعد کھلاڑیوں کا مقابلہ اولمپیا کے میدان میں ہوتا تھا اولمپیا کے مقابلے میں چنا جانا یا فقط شامل ہونا ہی ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ کھیلوں کے انہماک کا یہ نتیجہ نکلا کہ یونانی قوم دنیا کی زبردست قوم بن گئی اور اپنی طاقت، تہذیب اور حکمت کے زور سے نہ صرف دنیا کے کافی حصے پر حکمرانی کی بلکہ اپنی تہذیب کو بھی پھیلایا اس طرح اہل روما نے بھی تعلیم میں کھیل کو بہت زیادہ اہمیت دے رکھی تھی۔

زمانہ حال کی بڑی بڑی طاقتوں نے کھیل کو اتنی ہی اہمیت دی ہوئی ہے جتنی کہ تعلیم کو۔ اس کا واضح ثبوت عالمی اولمپک مقابلوں میں ان کے کھلاڑیوں کی شاندار فتح ہے۔ اگر ہم ایک زندہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی تعلیم

کے ساتھ کھیل کود کے میدان کی رونق بڑھانا ہوگی کیونکہ کھیلوں کو صحیح طریقے سے کھیلنے اور منظّم کرنے سے قوموں میں عظیم الشان انقلاب آیا ہے۔

عزیز طلبا!

کھیلوں کا صرف یہی فائدہ نہیں ہے کہ جسم تندرست وتوانا رہتا ہے بلکہ ان کے ذریعے نوجوان وہ تربیت حاصل کرتے ہیں جو آئندہ کے لیے مشعلِ راہ ہوتی ہے۔ تنظیم، اتحاد اور صبر وتحمل کا سبق ملتا ہے۔ خود اعتمادی کا مادہ پیدا ہوتا ہے ایک مشترکہ نصب العین کی خاطر تگ ودو کرنا اور ذاتی مفاد کے خیال کو ترک کر کے ٹیم یا پارٹی کے مفاد کی خاطر جدوجہد کرنا۔ یہ وہ صفات ہیں جو خود غرضی کو ختم کرتی ہیں یہی پارٹی یا ٹیم کے مفاد کا خیال اپنے دائرے سے نکل کر انسان کے اندر حب الوطنی کا قابل قدر جذبہ پیدا کرتا ہے۔ نظم وضبط، چستی وچالاکی اور دور اندیشی یہ وہ خوبیاں ہیں جو کسی بھی قوم کی تعمیر میں مدد ومعاون ہوسکتی ہیں۔

ڈیئر سٹوڈنٹس!

تفریح اور سکون کی تلاش انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ کھیل دلچسپی اور تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ تمام دن سکول، کالج اور دوسری مصروفیتوں کے بعد دماغ شام کے خوشگوار موسم میں اپنی تھکاوٹ کو آسائش اور سکون میں تبدیل کر لیتا ہے۔ کھیل کا میدان ہمیں سکھاتا ہے کہ قائد کی اطاعت اور ساتھیوں کے ساتھ بے لوث تعاون کی کتنی اہمیت ہے۔ دوسروں کی رہنمائی کس طرح کی جاتی ہے۔ نیز کھیل کے میدان میں مساوات کا اعلیٰ سبق ملتا ہے۔ یہاں امیر غریب، چھوٹے بڑے یا گورے کالے کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ دو حریف جب ایک دوسرے کے مقابلے میں اترتے ہیں تو ہر ایک کے دل میں جیت کی اُمنگ اچھا کھیلنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس طرح تگ ودو کے جذبات جنم لیتے ہیں جو زندگی کے میدان میں ترقی کا سبب بنتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں صحیح تربیت پانے والا نوجوان زندگی کے میدان کارزار میں کبھی ناکام نہیں ہوتا۔

عزیز طلبا!

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

If the Wealth is Lost
Then Nothing is Lost
But If the Health is Lost
Then Every thing is Lost

آج اور اس وقت میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ہم جس کام کا آغاز کرنے جا رہے ہیں اس میں ہمیں کامیابی سے ہمکنار فرمائے اور اس ایونٹ میں حصہ لینے والے تمام اساتذہ کرام اور طلبا کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

شکریہ

مضامین

پاکستان کی معیشت

پروفیسر ڈاکٹر میاں محمد اکرم
پرنسپل گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور

بلند و بالا پہاڑوں، لہلہاتے کھیتوں، بہتے دریاؤں اور جھرنوں، خوب صورت وادیوں، برف پوش چٹانوں، محنتی اور جفاکش نوجوانوں، پیار اور محبت سے گندھے ہوئے بزرگوں، عزت ماب اور شرم وحیا کا پیکر خواتین، کائنات میں رنگ بھرتے پیارے پیارے بچوں، صحراؤں میں اونٹوں کی قطاروں پر سامان لاد کر محنت کرنیوالوں، صنعتی میدان میں پاکستان کو ترقی کی منازل کی طرف لے جانیوالے مزدوروں اور دین کی سربلندی اور دینی اقدار کی پاسداری کرنے والے ۲۲ کروڑ سے زائد لوگوں کی سرزمین کا نام پاکستان ہے۔ جو کہ 1946ء میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں منصۂ شہود پر آیا۔ پاکستان رقبے کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے۔ اس کا کل رقبہ 7,96,096 مربع کلومیٹر ہے۔ یہ رقبہ فرانس اور برطانیہ کے مجموعی رقبے سے زیادہ ہے۔ دنیا میں آبادی کے لحاظ سے بھی پاکستان چھٹا بڑا ملک ہے۔ پاکستان کی جمیعت محنت (Labour Force) چھ کروڑ پچاسی لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل ہے۔ جبکہ بے روزگاری کی شرح گذشتہ سال 5.8 فی صد رہی۔

پاکستان کا مرکزی بنک سٹیٹ بنک آف پاکستان (State Bank of pakistan) ہے۔ پاکستان کا مالی سال کا دورانیہ یکم جولائی سے 30 جون ہے۔ گذشتہ سال پاکستان کی خام داخلی پیداوار میں اضافہ کی شرح 5.7 فی صد رہی۔ خام ملکی پیداوار (GDP) میں زراعت کا حصہ 18.9 فیصد، صنعت کا حصہ 20.9 فیصد اور خدمات کے شعبہ کا حصہ 60.23 فی صد رہا، پاکستان اقوام متحدہ، اسلامی کانفرنس (OIC)، سارک (SAARC) جیسے اداروں کا ممبر ہونے کے علاوہ SAFTA، ASEAN، WIPO، WTO، ECO جیسے اداروں کا بھی رکن ہے۔

پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے۔ پاکستان میں قدرتی گیس ملک کے مختلف حصوں میں وافر مقدار میں موجود ہے۔ سب سے بڑا ذخیرہ سوئی (بلوچستان) کے مقام پر ہے۔ پاکستان میں نمک کی دنیا کی دوسری سب سے بڑی کان ہے، کوئلے کا دنیا کا تیسرا بڑا ذخیرہ پاکستان میں ہے۔ جس میں کوئلے کی مقدار کا اندازہ ۱۸۵ ارب ٹن ہے جس کی مالیت سعودی عرب کے تیل کے ذخائر سے بھی زیادہ ہے۔ ماہرین کے مطابق پاکستان کے کوئلے کے ذخائر کی مالیت ۱۰ کھرب تا ۳۰ کھرب ڈالر کے درمیان ہے جو کہ پاکستان کی خام قومی پیداوار سے ۸۵ گنا زیادہ ہے۔ سونے کے ذخائر کے حوالے سے پاکستان دنیا میں پانچویں نمبر پر ہے۔ صرف ریکوڈک کے سونے کے ذخائر کی مالیت کا اندازہ سابق وزیر خزانہ

شوکت ترین کے مطابق ۵۰۰ ارب ڈالر ہے۔ تانبے کے ذخائر کے لحاظ سے پاکستان کا دنیا میں ساتواں نمبر ہے لیکن ابھی تک ہم ان ذخائر سے استفادہ نہیں کر رہے۔ ان کے علاوہ پاکستان میں کرومائیٹ، جپسم، سیسہ، زنک، پٹرولیم، بیرائیٹ، بنٹائیٹ، صنعتی مٹی اور سلیشیا جیسی دھاتیں موجود ہیں۔ سیسہ اور زنک کے ذخائر لسبیلہ میں ہیں۔ کرومائیٹ خضدار میں، کوئلہ تھر میں، لوہا پنجاب میں، اینٹی منی بلوچستان میں، کرومائیٹ پشاور میں، لوہے کے ذخائر کالا باغ، چنیوٹ، لنگڑیال اور چلغازی کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ بلوچستان میں سیسہ اور زنک کے ذخائر کا اندازہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن لگایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ گیلیئم، جرمینیئم، یورینیم، ہیومک ایسڈ اور بیزین کے ذخائر بھی پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔

پاکستان کی معیشت میں زراعت، صنعت اور خدمات کے شعبے اہم ترین ہیں، ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

1- زراعت (Agriculture): پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے، آبادی کی عظیم اکثریت (تقریباً 42.3 فی صد) زراعت کے شعبہ سے منسلک ہے۔ دیہات میں رہنے والے تقریباً 66 فی صد آبادی کسی نہ کسی طور زراعت کے شعبے سے وابستہ ہے۔ زراعت ملکی آمدنی کا بھی اہم ذریعہ ہے۔ پاکستان کی خام داخلی پیداوار (GDP) میں زراعت کا حصہ 18.9 فی صد ہے۔ پاکستان کی برآمدات میں زرعی پیداوار اور زراعت پر مبنی صنعتوں کا بہت اہم کردار ہے۔ اس شعبہ سے پاکستان اپنی برآمدات کا تقریباً 70% حاصل کرتا ہے، پاکستان کا شمار زرعی پیداوار کے لحاظ سے مسلمان ملکوں میں پانچویں نمبر پر اور دنیا بھر میں بیسویں (20 ویں) نمبر پر ہوتا ہے۔ اس طرح دنیا بھر میں دودھ کی پیداوار کے لحاظ سے پاکستان کا پانچواں نمبر ہے۔ پاکستان کی اہم فصلیں کپاس، گندم، چاول، گنا، پھل، سبزیاں اور چائے وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ دودھ، گوشت، انڈے اور پولٹری بھی نہایت اہم پیداوار ہیں۔ اس سال گندم کی پیداوار دو کروڑ پچپن لاکھ ٹن رہی۔

پاکستان میں زرعی پیداوار کے لحاظ سے دو طرح کے موسم پائے جاتے ہیں اور اسی کے لحاظ سے زرعی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں ''خریف'' جو کہ اپریل تا جون فصل کی بوائی اور اکتوبر تا دسمبر فصل کی کٹائی پر مشتمل ہے جب کہ ''ربیع'' کا آغاز اکتوبر تا دسمبر ہوتا ہے اور فصلوں کی کٹائی اپریل مئی میں کی جاتی ہے۔ گندم، مکئی، باجرہ، جوار، مونگ، ماش وغیرہ خریف کی فصلیں۔ جبکہ گندم، چنا، مسور، تمباکو اور جو وغیرہ ربیع کی فصلیں ہیں۔ پاکستان کی زرعی پیداوار میں گندم، کپاس اور گنا بڑی بڑی فصلیں شمار ہوتی ہیں اور کل زرعی پیداوار میں ان کا حصہ 88.7 فی صد ہے۔ پاکستان کا شمار دنیا بھر میں کپاس پیدا کرنے والے بڑے ملکوں میں ہوتا ہے۔ کل زرعی پیداوار میں کپاس کا حصہ 5.5 فی صد ہے اور خام داخلی پیداوار میں 1.0 فی صد ہے۔ پاکستان کی زرعی پیداوار میں چاول کی پیداوار کا حصہ 3.1 فی صد ہے۔ گزشتہ سال پاکستان میں تقریباً 74.4 لاکھ ٹن چاول پیدا ہوئے۔ پاکستان میں زرعی پیداوار میں گندم کا حصہ 9.1 فی صد ہے جو کہ خام داخلی پیداوار کے 1.7 فی صد کے برابر ہے۔

اس کے علاوہ پاکستان میں سورج مکھی، کنولا، بنولا اور دیگر تیلدار اجناس کے علاوہ مونگ پھلی، مسور و ماش اور چنے کی

دالیں، آلو پیاز اور مرچیں اہم فصلوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ملک میں صنعتوں کے فروغ اور ذرائع مواصلات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی وغیرہ کی اہمیت میں اضافہ کی وجہ سے زراعت کے شعبہ کا حصہ خام داخلی پیداوار میں روز بروز کم ہو رہا ہے۔ لیکن پاکستان کی ترقی کا راز اب بھی زرعی شعبہ کی ترقی میں ہی ہے کیوں کہ زراعت پاکستان کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔

-2 تجارت اور صنعتی شعبہ (Trade and Industrial Sector) : کسی ملک کی معیشت کے فروغ کے لیے تجارت اور صنعت کے شعبے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ آج دنیا کے 23 بڑے ملک دنیا کی تجارت کے 85 فی صد پر حاوی ہیں۔ اور یہ وہ ممالک ہیں کہ جن کی صنعتی بنیاد مضبوط ہے۔

الف۔ شعبہ تجارت (Trade Sector): وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان کی تجارتی بنیاد وسیع ہو رہی ہے۔ پاکستان میں درآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ 2018ء میں پاکستان کا تجارتی خسارہ 37.7 ارب ڈالر رہا۔ جو کہ خام داخلی پیداوار کا 15 فی صد تھا۔ ملک میں درآمدات کا حجم 60.9 ارب ڈالر رہا جبکہ برآمدات کا حجم 23.2 ارب ڈالر رہا۔ موجودہ حکومت نے اس خسارہ کو کم کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں جس کے نتیجہ میں یہ خسارہ کم ہونا شروع ہوا ہے۔

پاکستان کھانے پینے کی اشیاء میں چاول، مچھلی، پھل، مصالحے، تیلدار بیج، گوشت اور دیگر اشیاء برآمد کرتا ہے۔ ان کے علاوہ ٹیکسٹائل ہمارے برآمدات کا سب سے بڑا شعبہ ہے۔ یہ شعبہ ہماری برآمدات کا 66 فی صد روزگار کا 38 فی صد اور خام داخلی پیداوار کا 8.5 فی صد فراہم کرتا ہے۔ اس شعبہ میں خام کپاس، کاٹن یارن، کاٹن کلاتھ، نٹ ویئر، بیڈ ویئر، تولیے، سلے سلائے کپڑے وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ہماری برآمدات میں پٹرولیم کی مصنوعات، قالین، کھیلوں کا سامان، سرجری کے آلات، کیمیکل اور انجینئر نگ کا سامان شامل ہے۔ پاکستان کی زیادہ تر برآمدات امریکہ، جرمنی، برطانیہ، جاپان، ہانگ کانگ، دبئی اور سعودی عرب جاتی ہیں۔ جبکہ درآمدات میں کھانے کی اشیاء، مشینری، پٹرولیم بجلی کے آلات و سامان، گاڑیاں، خام مال، ٹیلی کام، کھادیں، سویابین، پام آئل، خام پٹرولیم، پلاسٹک، میڈیکل کی اشیاء، لوہا اور سٹیل شامل ہیں۔ پاکستان زیادہ تر درآمدات چین، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، جاپان، امریکہ، جرمنی اور کویت سے کرتا ہے۔

ب۔ صنعتی شعبہ (Industrial Sector): قیام پاکستان کے وقت پاکستان کا صنعتی شعبہ بہت زیادہ پسماندہ تھا۔ تقسیم ہند کے مرحلے میں پاکستان کو معمولی حصہ ملا۔ متحدہ ہندوستان میں سات بڑی صنعتوں میں 921 کارخانے تھے۔ ان میں سے صرف 34 کارخانے پاکستان کے حصے میں آئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کو جان بوجھ کر صنعتی ترقی سے دور رکھا کیونکہ انگریز ان علاقوں سے اپنی فوج کے لیے سپاہی بھرتی کرتے تھے۔

پاکستان کی اہم صنعتی پیداواریں درج ذیل ہیں: پاکستان کی کل صنعتی پیداوار میں بڑی صنعتوں کا حصہ 68.5 فی صد ہے۔ ان میں سیمنٹ، سوتی کپڑا، سوتی دھاگہ، چینی، کھادیں، سلے سلائے کپڑے، کپڑے دھونے کا صابن، گھی، پکانے کا تیل،

سگریٹ،موٹر سائیکل،سائیکل،سکوٹر، پیپر اور پیپر بورڈ، ٹائر، ریفریجریٹر، کاسٹک سوڈا، کاریں،بسیں،جیپیں،تمباکو کی اشیاءاور سگریٹ،ٹریکٹر وغیرہ شامل ہیں۔ان میں سے چند ایک کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے۔

(الف) ٹیکسٹائل کی صنعت: پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کا شمار دنیا کی بہترین صنعتوں میں ہوتا ہے۔پاکستان دنیا بھر میں کپاس پیدا کرنے والے ملکوں میں چوتھے نمبر پر ہے اور کاٹن استعمال کرنے والے ملکوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔پاکستان کل برآمدات میں اس صنعت کا حصہ تقریباً 66 فی صد ہے۔جبکہ یہ شعبہ 39 فی صد روزگار کے مواقع اور 8.5 فی صد خام داخلی پیداوار میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔اس شعبہ میں سوتی دھاگہ، ریشمی کپڑا،سوتی کپڑا،تولیے،ہوزری کا سامان،ریڈی میڈ کپڑے، کینوس،ترپال وغیرہ شامل ہیں۔

(ب) انجینئرنگ کی صنعت: دنیا بھر کی تجارت جس میں انجینئرنگ کا حصہ 63 فی صد ہے۔انجینئرنگ کے شعبہ میں آٹو موبائل سیکٹر سب سے اہم ہے اور دنیا بھر میں اسے صنعتوں کی ماں سمجھا جاتا ہے۔ بین الاقوامی تجارت میں آٹو موبائل کی صنعت کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔پاکستان میں یہ شعبہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔جس سے پاکستان میں روزگار کے مواقع پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیکس کی مد میں حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے۔پاکستان میں کاریں،موٹر سائیکلیں،ٹریکٹر، ٹرک،بسیں،جیپیں وغیرہ تیار کی جارہی ہیں اور دن بدن ان کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے۔

)ج(کھاد کی صنعت: پاکستان میں وقت گزرنے کے ساتھ کھاد کی کھپت میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔آج پاکستان میں کھاد بنانے کے 10 کارخانے کام کر رہے ہیں۔ان میں سے چار سرکاری شعبہ میں اور چھ نجی شعبہ میں ہیں۔آج پاکستان میں یوریا کھاد،سپر فاسفیٹ،امونیم نائٹریٹ اور نائٹروفاس کی کھادوں کی پیداوار کی جارہی ہے۔

(د) پینٹ اور وارنش: وطن عزیز کے 22 بڑے اور تقریبا 400 چھوٹے ادارے پینٹ اور وارنش تیار کر رہے ہیں۔ہاؤسنگ سیکٹر میں ترقی کی وجہ سے ملک میں پینٹ اور وارنش کی طلب میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

(ھ) سیمنٹ انڈسٹری: پاکستان میں سیمنٹ کی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔اس وقت پاکستان میں سیمنٹ کے 29 کارخانے کام کر رہے ہیں۔ان کی پیداواری صلاحیت 3.5 کروڑ ٹن سالانہ ہے۔

(د) گھریلو استعمال کی اشیاء کی صنعت: اس شعبہ میں ٹی وی، ریفریجریٹر اور ڈیپ فریزر وغیرہ کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔پاکستان میں بنکوں کی طرف سے لیز پر اشیاء کی فراہمی کی سکیموں اور پرائیویٹ سیکٹر میں قسطوں پر اشیاء کی فراہمی میں اضافہ اور نئی نئی سکیموں کی وجہ سے ان اشیاء کی طلب اور پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے اور اگلے چند سالوں میں ان کے پیداوار دوگنا ہونے کی توقع ہے۔

-3 تعلیم وصحت(Education and Health): تعلیم وصحت کسی ملک کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں:

(الف) شعبہ تعلیم(Education Sector): کسی بھی معاشرے اور معیشت کی ترقی کا انحصار تعلیم پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی معیشت تعلیمی ترقی کے بغیر معاشی ترقی کا تصور نہیں کر سکتی۔ آج دنیا کی معاشی حکمرانی ان ملکوں کے پاس ہے جو کہ تعلیم کے شعبے میں سب سے آگے ہیں۔ دین اسلام نے بھی تعلیم کو انسان کا بنیادی حق قرار دیا ہے اور تعلیم کے حصول کو ہر شخص کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے۔ تعلیم انسان کو خود آگہی دیتی ہے۔ اپنی ذات کا عرفان اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ انبیاء کے فرائض منصبی میں بھی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ پاکستان میں 10 سال اور اس سے اوپر کی عمر کے لوگوں میں خواندگی کی شرح 58 فی صد ہے۔ مردوں میں خواندگی کی شرح 70 فی صد ہے اور عورتوں میں 48 فی صد ہے۔ پاکستان میں پرائمری تعلیم مکمل کے بغیر سکول چھوڑنے والے بچوں کی تعداد کل داخلہ لینے والوں کی تعداد کا 10 فی صد ہے۔ پاکستان تعلیم پر خام داخلی پیداوار (GDP) کا صرف 2.3 فی صد خرچ کر رہا ہے، جبکہ بھارت 4.1 فی صد اور نیپال 3.4 فی صد خرچ کرتا ہے۔

)ب(شعبہ صحت (Health Sector): اچھی صحت انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ اس کے کام کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتی ہے۔ اس سے انسان میں زیادہ محنت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ صحت کی بنیادی سہولتوں کا حصول ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ دنیا کے بعض ممالک صحت اور تعلیم کو کتنی اہمیت دیتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے تعلیم وصحت کے بجٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً سویڈن میں عوام کی تعلیم اور صحت کے لیے بجٹ کا پچاس فی صد خرچ کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں صحت سے متعلقہ مسائل میں بچوں کی اموات کی شرح کو کم کرنا، زچہ و بچہ کی صحت کی بہتری، HIV/ AIDS، ٹی بی، ملیریا اور دیگر بیماریوں کو کنٹرول کرنا شامل ہے۔ پاکستان میں غربت میں کمی کرنے کے پروگرام (PRSP) کے تحت بھی رقوم صحت کے شعبہ کے لیے مختص کی گئیں، پاکستان اس معاملہ میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ اور عوام کو صحت کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ابھی تک پاکستان کی 66 فی صد آبادی پینے کے صاف پانی سے محروم ہے۔ 40 فی صد بچے غذائی قلت کا شکار ہیں۔ 957 لوگوں کے لیے صرف ایک ڈاکٹر ہے جبکہ 9730 لوگوں کے لیے ایک دندان ساز کی سہولت حاصل ہے۔ ساڑھے 15 کروڑ عوام کے لیے صرف 4712 ڈسپنسریاں، 5336 بنیادی مراکز صحت، 924 ہسپتال ہیں۔ پاکستان صحت کی سہولتوں کی فراہمی پر اپنی GDP کا صرف 0.91 فی صد خرچ کرتا ہے۔

پاکستان کو درپیش معاشی مسائل: پاکستان اپنے وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی بہت سے معاشی مسائل کا شکار رہا۔ بڑے پیمانے پر ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی بحالی، ٹوٹے پھوٹے معاشی ڈھانچے کے ساتھ پاکستان نے ترقی کے سفر کا آغاز کیا۔ قوم میں جذبہ تھا، جس کی وجہ سے ساٹھ کی دہائی میں پاکستان کی شرحِ ترقی مثالی رہی۔ لیکن اس کے بعد کے سالوں میں سیاسی عدم استحکام، ناانصافی، اقربا پروری، کرپشن اور بہت سی دیگر وجوہات کی بنا پر پاکستان کی ترقی کی وہ شرح برقرار نہ رہ سکی جس کا آغاز قیام پاکستان کے بعد ہوا تھا۔ اسی طرح غلط منصوبہ بندی اور بے تحاشا اور غیر ضروری اخراجات کی وجہ سے پاکستان پر

اندرونی اور بیرونی قرضوں کا بوجھ بڑھتا رہا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے بجٹ کا بڑا حصہ اور بعض سالوں میں محصولات کی آمدنی کا نوے فیصد تک قرضوں اور سود کی ادائیگی کے ضمن میں خرچ ہوتا رہا۔ پاکستان کو اس وقت بہت سے معاشی مسائل کا سامنا ہے،ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

ا۔مہنگائی اور افراط زر: روپے کی قدر میں مسلسل کمی اور اس کے نتیجے میں درآمدی اشیاء اور خام مال کی بڑھتی ہوئی قیمتوں،بچوں کی تعلیم کے بڑھتے ہوئے اخراجات،گیس کی قیمتوں میں اضافہ،درآمدی ڈیوٹی اور ایکسائز ڈیوٹی میں اضافہ،ادویات کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ،خوراک اور غیر خوراک کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔افراط زر سے ادویات کی قیمتوں میں ہونے والے اضافہ سے صحت کے شعبہ کے افراط زر(Health Inflation) کو8.1 فیصد کی سطح پر پہنچا دیا ہے۔

۲۔بڑھتی ہوئی غربت:افراط زر میں مسلسل اضافہ، بڑھتی ہوئی بے روزگاری،ٹیکسوں میں اضافہ،مختلف قسم کے اعانوں (Subsidies) میں کمی اور کاروباری مندے کی وجہ سے ملک میں غربت مسلسل بڑھ رہی ہے۔اس کی وجہ سے جرائم کی شرح بھی بڑھ رہی ہے۔250 روپے روزانہ کمانے کے بین الاقوامی معیار کے مطابق پاکستان کی70 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے،جبکہ100 روپے روزانہ کے معیار کے مطابق پاکستان کی24 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے ہے۔ضرورت سے زیادہ اناج پیدا ہونے کے باوجود غریب عوام دو وقت کی روٹی کو ترس رہے ہیں۔عوام کی قوت خرید میں کمی کے باعث عوام غربت کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔

۳۔بے روزگاری میں اضافہ:پاکستان اس وقت بے روزگاری،بھوک،غربت، بڑھتی ہوئی مہنگائی اور افراطِ زر کے شکنجے میں کسا جاچکا ہے۔جس سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ادارہ شماریات کے مطابق جون2018ءکو ختم ہونے والے مالی سال میں پاکستان میں بے روزگاری کی شرح5.8 فیصد رہی اور اب کرونا کی وجہ سے بیروزگاری اور بڑھ گئی ہے۔پاکستان میں شہری آبادی میں بے روزگاری دیہی علاقوں کے مقابلہ میں کم ہے۔غربت اور بے روزگاری کی وجہ سے وطن عزیز میں جرائم کی شرح میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

۴۔تجارتی خسارہ میں اضافہ:کم برآمدات اور زیادہ درآمدات کی وجہ سے پاکستان کی تجارت خارجہ ہمیشہ دباؤ کا شکار رہی ہے۔اس کی وجہ سے پاکستان کا ادائیگیوں کا توازن خسارے کا شکار رہتا ہے۔اس کی وجہ سے پاکستانی روپیہ بھی دباؤ کا شکار رہتا اور اس کی بیرونی کی قدر بھی مسلسل کم ہو رہی ہے۔

۵۔ٹیکسوں میں اضافہ:پاکستان میں ٹیکسوں میں مسلسل ہونے والے اضافہ نے اشیائے ضرورت کی اشیاء اور یوٹیلیٹی بلوں کو بے انتہاء اضافہ کر دیا ہے۔اس اضافہ کے بوجھ نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔اس کے مقابلہ میں وطن عزیز میں پراپرٹی

کے شعبہ میں کم از کم ۱۵۰۰۰ارب روپے کے ٹیکس اکٹھے کرنے کی صلاحیت ہے لیکن یہ شعبہ نظر انداز ہوا ہے پہلے سے ٹیکس ادا کرنے والے لوگوں پر ٹیکس کا مزید بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان لوگوں کو ٹیکس نیٹ(Tex Net) میں لایا جائے جو ٹیکس ادا کر بھی سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ٹیکس ادا نہیں کرتے۔

۶۔گردشی قرضوں میں اضافہ: پاکستان میں گردشی قرضے مسلسل بڑھ رہے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ قومی اداروں اور بااثر افراد کی طرف سے یوٹیلیٹی بلوں کی عدم ادائیگی اور قومی اداروں کی غفلت ومنصوبہ بندی کا فقدان ہے۔یہ گردشی قرضے پاکستان کے خزانہ اور عوام پر بوجھ ہیں۔

۷۔قرضوں پر بڑھتا ہوا انحصار: پاکستان کا مجموعی بیرونی قرض ۲۰۱۷ء کی آخری سہ ماہی میں ۸۸۸۹۱ارب روپے تک پہنچ چکا تھا،جبکہ تیسری سہ ماہی میں یہ قرض ۸۵۰۵۲ارب روپے تھا۔اگر گزشتہ سالوں کے ساتھ اس کا تقابل کیا جائے تو کیفیت کچھ یوں ہے کہ ۲۰۰۴ء کی آخری سہ ماہی میں پاکستان کا کل قرض ۳۳۱۷۲ارب روپے تھا،جواب بڑھتے بڑھتے تقریباً ۹۰ارب ڈالر سے زائد ہو چکا ہے۔۱۹۷۱ء میں پاکستان صرف ۳۰ارب روپے کا مقروض تھا۔۱۹۹۰ء میں یہ قرض ۱۱۷ارب روپے اور ۱۹۹۲ء میں بڑھ کر ۱۷۰۴ارب روپے ہوگیا۔اس کے بعد تو جیسے ان قرضوں کو پر ہی لگ گئے،اگلے تین سالوں (یعنی ۱۹۹۹) میں یہ رقم بڑھ کر ۲۹۴۶ارب روپے ہوا،۲۰۰۸ء میں یہ رقم بڑھتی ہوئی ۶۱۲۶ ارب روپے ہوگئی۔۲۰۱۶ء آتے آتے کل ملکی قرضہ ۲۲۰۰۰ارب روپے ہوگیا،جس میں ۱۴۷۸۷ارب روپے ملکی اور ۷۲۰۰ارب روپے کے غیر ملکی قرضے شامل تھے۔گزشتہ حکومت نے ۲۰۱۶ء تک کے چار سالوں میں ۸۰۰۰ارب روپے قرضے لیا۔موجودہ حکومت بھی مسلسل مختلف ممالک سے قرض لے رہی ہے۔

۸۔ذہانت اور سرمایہ کا انخلاء: کھربوں ڈالر کے سونے،تانبے،کوئلے اور نمک وغیرہ کے ذخائر موجود ہونے کے باوجود عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھ رہا ہے،بجلی،گیس،پٹرولیم مصنوعات مہنگی ہو رہی ہیں۔جس کے نتیجے میں معیشت کا پہیہ جام ہو رہا ہے،گزشتہ عرصہ میں بہت سے کارخانے بند اور مزدور بے روزگار ہو چکے ہیں،ملک سے سرمایہ کا بہت تیزی سے انخلا ہوا۔اس کی وجہ سے ملک میں بے روزگاری اور غربت میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔اس انخلا کو روکنے کی ضرورت ہے۔بہترین ذہین افراد ملک سے بیرون ملک منتقل ہو رہے ہیں یعنی Brain Drain ہو رہا ہے۔

۹۔زرعی شعبہ کو درپیش مشکلا : پاکستان کا زرعی شعبہ گوناگوں مسائل کا شکار ہے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

1- ہماری زراعت کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہماری فی ایکڑ پیداوار دیگر ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ان اسباب کا سدباب کر کے جب تک فی ایکڑ پیداوار کو زیادہ نہیں کیا جائے گا ہماری ترقی کی رفتار تیز نہیں ہوسکتی۔

2- پاکستان میں زیرِ کاشت رقبہ کا تقریباً 2/3 حصہ بارانی ہے اس حصے کی پیداوار کا انحصار موسمی حالات پر ہوتا ہے۔ اس بارانی زمین کو اگر آبپاشی کی سہولیات فراہم ہو جائیں تو مجموعی پیداوار اور فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

3- زرعی شعبہ میں بھی قلت سرمایہ کو دو صورتوں میں شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ قلت مطلق یہ ہے کہ اگر سرمایہ میسر آ جائے تو مزید زمین زیرِ کاشت آسکتی ہے نئے کارآمد آلات اور بیجوں کے استعمال سے پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ قلتِ اضافی سے مراد یہ ہے کہ اگر ہمارے کسانوں کو ضروری سرمایہ میسر آ جائے تو بجائے نیا رقبہ زیرِ کاشت لانے کے پہلے ہی رقبہ سے جدید کھاد اور ترقی یافتہ بیجوں کے ذریعے پیداوار میں اضافہ عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ ہمارے چھوٹے کسانوں کے پاس قرضوں کے حصول کے لیے ضمانتیں نہیں ہوتیں اس لیے قرضے حاصل نہیں کر سکتے۔

4- ہمارے ملک میں زمین درتقسیم ہوتے ہوتے چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کی صورت میں مالکوں کے پاس رہ گئی ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے قطعات پر جدید مشینری کا استعمال مشکل ہوتا ہے اور دوسرے ان کے مالکان کی حالت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ جدید طریق ہائے پیدائش کے اخراجات برداشت بھی نہیں کر سکتے۔

5- ہمارے کسانوں کی مالی حالت چونکہ کمزور ہوتی ہے اس لیے وہ جدید بیج استعمال نہیں کر سکتے اگر حکومت کسی ایجنسی کے ذریعے ان کو ترقی یافتہ بیج فراہم کرے تو ہماری پیداوار میں 25 فیصد اضافہ ہوسکتا ہے۔

6- ابھی بھی ہمارے ملک میں جدید کھاد کا استعمال ضرورت کے مطابق نہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر ضرورت کے مطابق ہر فصل کے لیے مناسب کھاد کا استعمال کیا جائے تو ہماری پیداوار میں 50 فیصد اضافہ ہوسکتا ہے۔

7- فصلوں کی بیماریوں اور کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے ہماری زرعی پیداوار میں 15 فیصد کمی ہو جاتی ہے لہٰذا ضروری ہے کسانوں کو مناسب ادویات کم قیمتوں پر فراہم کی جائیں تا کہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکے۔ 1993ء میں کپاس کی فصل کو وائرس کی بیماری سے شدید نقصان ہوا اس سے ہماری کپڑے کی صنعت بھی متاثر ہوئی۔

8- پاکستان میں کاشتکاروں کو زرعی اجناس کی مناسب قیمت نہیں ملتی۔ دلال اور کمیشن ایجنٹ قیمت کا کافی حصہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔

9- ہمارے ملک میں رائج نظام زمین داری نے بھی مالک زمین اور مزارع کے درمیان کشیدگی پیدا کر رکھی ہے جس سے زرعی پیداوار پر بُرا اثر پڑتا ہے اس صورتِ حال کی اصلاح ضروری ہے۔ مالکان زمین اور مزارعین دونوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات کرنے چاہئیں تا کہ دونوں مل کر کامل یکسوئی اور باہمی اعتماد کے ساتھ عمل کاشتکاری میں اپنا حصہ ادا کر سکیں دونوں فریقوں کے حقوق کے تحفظ سے ہی دونوں میں زرعی ترقی کی خواہش پیدا ہوگی۔

ان معاشی مشکلات سے نجات اور خود انحصاری کی منزل کے حصول کے لیے چند تجاویز:

۱۔ قرضوں سے نجات اور خود انحصاری کی منزل کے حصول، غربت و بیروزگاری کے خاتمے، معاشی ترقی کی منازل طے کرنے اور عوامی فلاح و بہبود کے لیے ہمیں اپنے معاشی اہداف کا طویل عرصے پر مبنی پلان بنانا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے مختلف عرصہ ہائے وقت کے لیے اپنی منزل کا تعین کرنا ہوگا۔ مثلاً اگلے پانچ سال بعد ہم کہاں کھڑے ہوں گے؟ اور اس سے اگلے پانچ سال بعد کہاں؟ ہم جو پالیسیاں بھی مرتب کریں ان کے ضمن میں اپنی سمت متعین کی جائے۔ ان اقدامات کو قانونی تحفظ حاصل ہو۔ مستقبل میں اس سمت اور ان اہداف کو کوئی بھی حکومت تبدیل نہ کر سکے۔ تاہم ان اہداف کے حصول کے لیے ہر آنے والی حکومت اپنی حکمت عملی کا اعلان کرے ان تمام اقدامات اور حکمت عملی کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے اور پارلیمنٹ کی اجازت سے ہی اس میں تبدیلیاں کی جاسکیں۔

۲۔ اپنی پالیسیوں کو تشکیل کرتے ہوئے وطن عزیز کو رب کائنات کی طرف سے عطا کردہ قدرتی، صنعتی، زرعی اور انسانی وسائل کو مدنظر رکھا جائے۔ ان وسائل کے بہترین استعمال کو یقینی بنایا جائے اور انہی کی روشنی میں معاشی پالیسیاں تشکیل دی جائیں۔

۳۔ بجٹ سازی کے عمل میں بھی اپنے وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اخراجات کا میزانیہ تشکیل دیا جائے۔ موجودہ قرضوں سے بتدریج نجات حاصل کرنے کی کوشش اور نئے قرضوں میں بتدریج کمی لا کر خود انحصاری کی منزل کی جانب قدم بڑھائے جائیں۔ اس ضمن میں سرکاری اداروں کے ماہرین کے ساتھ ساتھ نجی شعبہ سے محبِّ وطن اور صاحب فکر افراد کو مشاورت میں شریک کیا جائے۔

۴۔ حکومتی اخراجات میں نمائشی اقدامات اور بے جا اخراجات سے بچتے ہوئے وسائل کے بہترین استعمال پر توجہ دی جائے۔ ان اخراجات میں کرپشن اور بدترین حکومت (Bad Governance) سے بچا جائے، اخراجات کرتے ہوئے ضروری اخراجات پر وسائل خرچ کیے جائیں۔ ایسے اخراجات ہوں جن کے نتیجے میں غربت اور بے روزگاری ختم ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ درآمد و برآمدات کے متبادلات کی پیداوار پر توجہ دی جائے۔ برآمدات بڑھانے اور خاص طور پر حتمی اشیاء (Finished Goods) کی برآمدات پر توجہ دی جائے، خام مال کی برآمد سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس خام مال سے حتمی اشیاء پیدا کر کے برآمد کی جاسکیں۔

۵۔ کرپشن اقربا پروری اور بے جا اخراجات کے تمام ذرائع کا سدباب کیا جائے تاکہ کرپشن کی نذر ہونے والے وسائل ملکی ترقی پر خرچ ہوں اور قرض لینے کی نوبت ہی نہ آئے۔

۶۔ بیرون ملک کام کرنے والے پاکستانی ہمارا بہت بڑا اثاثہ ہیں ان کو عزت و اکرام دیا جائے، ان کے ملکی معاملات میں

اعتماد کو بڑھانے کے لیے اقدامات کیے جائیں، ان کی طرف سے بھیجی جانے والی رقوم کو سرمایہ کاری میں لگانے کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو ان کی رقوم کو محفوظ بھی رکھیں اور سرمایہ کاری کے ذریعے ان میں اضافہ کا سبب بھی ہوں۔ یوں ہمیں زرمبادلہ کی صورت میں بڑی رقوم حاصل ہوسکیں گی اور ڈالرقرض لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مزید برآں وہ صاحب ثروت افراد جو غیر ممالک میں مقیم ہیں اور اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو ترغیب دی جائے کہ وہ غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی میں اپنا کردار ادا کرکے پاکستان کو سربلند کریں۔

۷۔ شعبہ تعلیم میں ہمیں اپنی ترجیحات طے کرنا ہوں گی ہمیں کن شعبوں کی ضرورت ہے؟ کس شعبہ میں ہمیں کتنے افراد تیار کرنے ہیں؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم توجہ طلب ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عمرانی علوم کو بھی اہمیت دینا لازمی ہے۔ کیونکہ معاشرے صرف سائنس و ٹیکنالوجی کی بنا پر ترقی نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں فرسودہ نظام تعلیم کی بات تو کی جاتی ہے لیکن اس نظام کو بدلنے پر آج تک توجہ نہ دی جاسکی۔ ہمیں تعلیم کو اپنی ترجیح اوّل قرار دینا ہوگا۔ یقیناً اس کے نتیجے میں ہم اپنے انسانی وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کرکے بہتر نتائج حاصل کرسکیں گے۔

۸۔ نوجوان ہمارے وطن عزیز کا بہت بڑا اثاثہ ہے ہم جو قرض حاصل کرتے ہیں ان رقوم کو نوجوانوں کی قابلیت کو بڑھانے (Capacity Building) کے لیے استعمال کرنا چاہیے، یقیناً اس کے نتیجے ہم اپنے اس اثاثہ کو بہترین نتائج کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔

۹۔ نوجوانوں اور بے روزگار افراد کو روزگار کی فراہمی کے لیے ہمیں چین کی طرح Pre Workshops پر توجہ دینا ہوگی اور اس مقصد کے لیے مشاورتی ادارے قائم کرنے ہوں گے۔

۱۰۔ وطن عزیز میں کاروبار کرنے کے اخراجات (Cost of Business) کو کم کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں کوئی شخص کاروبار کرنا چاہتا ہے تو بہت سے محکمے اس کاروبار کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ بجلی مہنگی ہے، گیس ملتی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے Cost of doing business کو کم سے کم کیا جائے۔ ایک ٹیکس کی پالیسی کو اختیار کیا جائے۔ کاروباری افراد پر اعتماد کیا جائے اور ان کو عزت و اکرام دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں یقیناً کاروباری افراد بہتر منصوبہ بندی سے زیادہ بہتر پیداوار حاصل کرسکیں گے۔ اس کے نتیجے میں درآمدات کا پریشر کم ہوگا برآمدات زیادہ کی جاسکیں گی۔ تاہم اس حوالہ سے کاروباری لوگوں کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور ملکی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔

ان معاشی مشکلات سے نجات اور خودانحصاری کی منزل کے حصول کے لیے قرآن پاک سے رہنمائی:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے وسائل اور اتنی زبردست قوم ہونے کے باوجود ہم ان مسائل کے پہاڑوں کے نیچے کیوں

دیے ہوئے ہیں۔اس سوال کا جواب قرآن کی سورۂ طہٰ کی آیات ۱۲۴تا۱۲۷ دیتی ہیں:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰى (۱۲۴) قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْٓ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا (۱۲۵) قَالَ كَذٰلِكَ أَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (۱۲۶) وَ كَذٰلِكَ نَجْزِىْ مَنْ أَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَشَدُّ وَ أَبْقٰى (۱۲۷)

ترجمہ: جو میرے ذکر (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا کی زندگی تنگ ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اُٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: پروردگار دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اُٹھایا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہاں اسی طرح تو نے ہماری آیات کو جب کہ وہ تیرے پاس آئیں تھیں، بھلا دیا تھا۔اسی طرح آج تو بھی بھلایا جارہا ہے۔اسی طرح ہم حد سے گزرنے والے کو (دنیا میں) بدلہ دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔

سورۂ النحل کی آیت نمبر ۱۱۲ تو بالکل پاکستان کی موجودہ صورتحال کی عکاسی کرتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○

ترجمہ: اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے، وہ جو امن واطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا، تب اللہ تعالیٰ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبت ان پر چھا گئی۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا، ہر طرح کے وسائل فراہم کیے۔ ہر طرح کا رزق ہماری ضرورت سے زائد ہمیں عطا کیا، لیکن ہماری ناشکری، دین اسلام سے روگردانی، کفر کے نظام اور کفار کی کاسہ لیسی اور پیروی کے رویے نے دین اسلام کے نظام کے نفاذ کے مقابلے میں انگریز کے قانون کو دستور کی بنیاد بنایا۔ اسی کا نتیجہ وہ مسائل ہیں جن کا اوپر تذکرہ ہوا ہے، آج پاکستان بدامنی اور خوف کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ اسلام آباد جیسے پرامن شہر میں ایک سال میں ۶۰۰ گاڑیاں چوری ہوئیں، دیگر جرائم ان کے علاوہ ہیں خوف کی جس کیفیت میں پورا ملک گرفتار ہے اس سے ہر فرد واقف ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال سے نکلنے کی کیا راہ ہے؟ قرآن پاک نے اس کا جواب بھی سورۂ الاعراف اور سورۂ نوح میں دے دیا۔

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (الاعراف ۷:۹۶)

ترجمہ: اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اس بڑی کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

گویا اس صورت سے نکلنے کی دو شرائط قرآن نے بیان کی ہیں:

(الف) ایمان: اپنے ایمان کی تجدید کی جائے اور رب کی طرف رجوع کیا جائے۔

(ب) ہر معاملے میں تقویٰ کو پیش نظر رکھا جائے۔

انشاءاللہ یہ حالات سدھر سکتے ہیں۔ خوف، بدامنی، بے روزگاری، غربت اور اشیا کی قلت سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں سورۂ نوح کی درج ذیل آیات اس صورت حال سے نکلنے کی راہ بتاتی ہیں، ارشاد باری تعالیٰ:

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَهَارًا O فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا O وَاِنِّیۡ كُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَهُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًا O ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُهُمۡ جِهَارًا O ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَهُمۡ وَاَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ اِسۡرَارًا O فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا O یُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡكُمۡ مِّدۡرَارًا O وَّیُمۡدِدۡكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِیۡنَ وَیَجۡعَلۡ لَّكُمۡ جَنّٰتٍ وَّیَجۡعَلۡ لَّكُمۡ اَنۡهٰرًا O

(نوح: ۷۱:۵۔۱۲)

ترجمہ: اس نے (حضرت نوحؑ) نے عرض کیا اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا، مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تا کہ تو انہیں معاف کر دے، انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانپ لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے اعلانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔ میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں ہمارے لیے راہ عمل یہی ہے کہ ہم:

اپنے ایمان کی تجدید کریں اور اس کی دعوت ہر دوسرے مسلمان کو دیں کہ وہ رجوع الی اللہ کریں، اپنے رب کی طرف آئیں، اس کے احکام کی پابندی کریں، اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی اس کے قانون کے تابع کر دیں، اور اس کے دیے ہوئے ضابطۂ زندگی کو وطن عزیز کا قانون و دستور بنا دیں۔

پاکستان کا ٹیکس کلچر

محمد بلال (اسسٹنٹ پروفیسر معاشیات)

ہر حکومت کی یہ بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ملکی سرحدوں کا دفاع ملک کی تعمیر و ترقی، امن و امان کا قیام، عدلیہ، انتظامیہ، مقنّنہ کا قیام، عوامی فلاح و بہبود، بے روزگاری کا خاتمہ، علاقائی عدم مساوات کا خاتمہ، افراط زر کو کنٹرول اور ملکی آبادی کو بنیادی سہولتوں کی فراہمی جیسے اقدامات کرے۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکومت کو عوام کا تعاون حاصل نہ ہو۔ عوام کے تعاون کی ایک شکل عوام پر عائد کردہ مختلف اقسام کے ٹیکس ہیں۔ کوئی بھی حکومت مندرجہ بالا ذمہ داریوں سے عہدہ براہ نہیں ہوسکتی جب تک اس کے پاس آمدنی نہ ہو۔ موجودہ دور میں ٹیکس حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

کسی قوم کی بقا کے لیے مضبوط معاشی نظام کا ہونا ضروری ہے۔ یہ معاشی نظام قوموں کو خوشحالی اور عظمت عطا کرتا ہے تاہم ایک اچھا معاشی نظام اپنے ٹیکس کلچر پر انحصار کرتا ہے۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے یہ عنصر آغاز سے کمزور رہا ہے۔ پاکستان میں ٹیکس کلچر کا موجودہ منظر نامہ بہت قابل رحم ہے۔ لوگ ٹیکس کو اپنے اوپر بوجھ تصور کرتے ہیں اس لیے وہ ٹیکس سے بچنے کے لیے مختلف غیر قانونی اور غیر اخلاقی حربے استعمال کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ ٹیکس کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں اس کو بوجھ تصور کیا جاتا ہے۔ ناروے، ڈنمارک، سویڈن، فن لینڈ، آئس لینڈ اور ہالینڈ میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت ٹیکس کا تناسب بہت بلند ہے۔ ان ممالک کے لوگ اپنی آمدنی کا 62% سے 68% بطور ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

پاکستان میں جی ڈی پی کے تناسب سے ٹیکس دینے والوں کی شرح 12%-11 ہے۔ جبکہ ورلڈ بینک کے مطابق یہ شرح 23% ہونی چاہیے۔ بھارت میں یہ شرح 17.7% ہے۔ نیپال میں 23.1%، ترکی میں یہ شرح 24.9% اور ملائیشیا میں یہ شرح 15.5% ہے۔ اگر ہم اس شرح کا موازنہ ترقی یافتہ ممالک سے کریں تو ہمارے ہاں یہ شرح بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر آسٹریلیا میں یہ شرح 25.8%، امریکہ میں یہ شرح 26.9%، نیوزی لینڈ میں یہ شرح 34.5%، ناروے میں یہ شرح 54.8% ہے اور یورپی ممالک میں یہ شرح 39%-37 ہے۔

ایف بی آر کی رپورٹ کے مطابق220 ملین پاکستانیوں میں سے صرف1.074 ملین لوگ ٹیکس دیتے ہیں۔ جوکل آبادی کا ایک فیصد سے بھی کم ہے۔2008ء میں768173 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے 477896 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ290227 لوگوں نے ٹیکس ادانہیں کیا۔2009ء میں855389 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے526867 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ328522 لوگوں نے ٹیکس ادانہیں کیا۔ 2011ء میں829129 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے406316 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ 422813 لوگوں نے ٹیکس ادانہیں کیا۔2012ء میں835945 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے 403927 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ432018 لوگوں نے ٹیکس ادانہیں کیا۔2013ء میں936504 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے527177 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ409327 لوگوں نے ٹیکس ادانہیں کیا۔2014ء میں1118138 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے662743 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ455395 لوگوں نے ٹیکس ادانہیں کیا۔2015ء میں حکومت کی تمام کوششوں اور ایمنسٹی سکیم کے باوجو1294623 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے838667 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ455956 لوگوں نے کوئی ٹیکس ادانہیں کیا۔ 2016ء میں1472762 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے961757 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ 511005 لوگوں نے ٹیکس ادانہیں کیا۔2017ء میں1608882 لوگوں نے ٹیکس ریٹرن فائلز جمع کروائیں ان میں سے 1074792 لوگوں نے ٹیکس ادا کیا جبکہ534090 لوگوں نے ٹیکس ادانہیں کیا۔2018ء میں ٹیکس فائلز کی تعداد 1695560 تھی جبکہ2019ء میں یہ تعداد بڑھ کر2472609 ہوگئی۔ان میں زیادہ تر تعداد سرکاری ملازمین کی ہے۔ان اعداد وشمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں ٹیکس دینے والوں کی شرح انتہائی کم ہے۔گورنر سٹیٹ بینک ڈاکٹر رضا باقر کے مطابق ملک میں نقد کیش کی طلب بڑھ رہی ہے اس لیے لوگ بینکوں سے رقوم نکال رہے ہیں کیونکہ لوگ ٹیکس نیٹ کے دائرے میں نہیں آنا چاہتے۔

ٹیکس اکٹھا کرنے کے لیے جو اصول مدنظر رکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر مصارف کم سے کم آئیں یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ٹیکس اکٹھا کرنے والا عملہ دیانت دار اور ایمان دار ہو بصورت دیگر ایسا ممکن نہیں۔ اگر عملہ ٹیکس میں خرد برد کرے گا تو ملکی خزانے میں کیا جمع ہوگا؟ ترقی یافتہ ممالک میں ٹیکس قوانین اتنے سخت اور شفاف ہیں کہ کوئی عام شہری یا اعلیٰ حکومتی عہدہ دار ٹیکس چوری کا تصور بھی نہیں کرسکتا جب کہ پاکستان میں یہ صورتحال اس کے برعکس ہے۔ ہمارے ملک میں ٹیکس میں خرد برد ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔اس نے ملک کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ بدقسمتی سے ٹیکس وصولی میں خرد برد ایک فن کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور اسے صلاحیت سمجھا جانے لگا ہے۔ بجٹ بناتے وقت جو ٹیکس آمدنی کا ہدف مقرر کیا جاتا ہے وہ شاید ہی کبھی حاصل

ہوا ہو۔ پاکستان اگر اپنی ٹیکس آمدنی میں اضافہ نہیں کرتا تو اسے کشکول لیے ترقی یافتہ مما لک، عالمی مالیاتی اداروں اور عرب مما لک کے پاس جانا پڑے گا۔جس سے قرضے اور سود کی ادائیگی بڑھ جائے گی اور ملک کی معاشی حالت ابتر ہوتی جائے گی۔ 2008ء میں پاکستان تقریباً 36 ارب ڈالر کا مقروض تھا، دس سال بعد پاکستان تقریباً 90 ارب ڈالر کا مقروض ہو گیا۔ اس عرصہ میں اتنا بڑا قرضہ کیوں لیا گیا عوام اس سے بے خبر ہیں۔ پاکستان اس وقت 100 ارب ڈالر سے زیادہ کا مقروض ہے یہی وہ بات ہے جو پاکستان کے متمول طبقہ سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ ٹیکس پوری دیانت داری سے ادا کرے۔ اس سے قرضوں میں کمی آئیگی اور ملک کی معاشی حالت بھی بہتر ہو جائے گی اور کشکول سے بھی نجات مل جائے گی۔

ٹیکس ایجوکیشن ٹیکس کلچر کو فروغ دینے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ یہ لوگوں پر عائد کردہ مختلف اقسام کے ٹیکس کی ایمانداری اور فوری ادائیگی کے لیے مائل کر سکتی ہے۔ لوگوں کو ان کی شہریت کی بنیادی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے ٹیکس ایجوکیشن کی مہم وسیع پیمانے پر مہم چلانی چاہیے۔ اس کے لیے اساتذہ اور جیّد علماء کرام کی مدد لی جا سکتی ہے۔ نیز اس مہم کو کامیاب بنانے کیلئے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا استعمال بہت ضروری ہے۔ ٹیکس ایجوکیشن لوگوں میں ٹیکس ادائیگی کے رویے کو جنم دے گی۔

امریکی عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس اولیور وینڈیل ہومز کا کہنا ہے، تہذیب کی قدر کا انحصار نظام ٹیکس پر ہوتا ہے۔ درحقیقت ٹیکس کے موثر نظام کے بغیر ترقی یافتہ معاشرے کی تخلیق عمل میں نہیں آسکتی۔ آج اگر مغرب کے شہری اعلیٰ معیارِ زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں تو یہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ ان مما لک میں صحت مند ٹیکس کلچر موجود ہے۔ ہر شہری دیانت داری کے ساتھ ٹیکس میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ لہٰذا ایک ناقص ٹیکس کلچر کسی بھی طرح مہذب تہذیب کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

پاکستان میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو روزانہ دس ہزار سے بھی زیادہ کماتے ہیں لیکن وہ ٹیکس نہیں دیتے۔ شاید ہمارے ملک کا نظام ٹیکس اتنا فرسودہ ہے کہ وہ ان لوگوں سے ٹیکس وصول نہیں کر پاتا۔ امیر طبقہ لاکھوں روپیہ اشیاء تعیّشات کی خریداری پر خرچ کرتا ہے لیکن وہ بھی ٹیکس ادا نہیں کرتا۔ قصہ مختصر پاکستان میں ٹیکس کلچر کا فروغ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ ٹیکس کلچر کے فروغ کے لیے ہر پاکستانی کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا لیکن یہ تبھی ممکن ہے کہ نظام ٹیکس اور پورے نظام سے کرپشن کو ختم کیا جائے اور قوم کو یقین دلایا جائے کہ ان کے خون پسینے کی کمائی صحیح مقام پر خرچ ہوگی۔

حافظ آباد کے سکھ حکمران

تحقیق: ڈاکٹر رائے عمران خان کھرل

حافظ آباد مغل دور میں حافظ میراک نامی اکبر اعظم کے ایک وزیر مشیر نے آباد کیا اور لاہور سے کپور اور چوپڑا قبیلہ کے کھتری یہاں آ کر آباد ہوئے اس وقت کے بعد اس کی اہمیت میں کچھ یوں اضافہ ہوا کہ مغل دور میں لاہور صوبہ کی سرکار (ڈویژن) رچنا دوآب کے چار محل (اضلاع) یعنی ایمن آباد، ساہوملی، باغ رائے بچا اور حافظ آباد تھے لہٰذا حافظ آباد کی شناخت گجرانوالہ، شیخوپورہ، سیالکوٹ، گجرات سے پہلے کی ہے مغل دور میں آئین اکبری کے مطابق حافظ آباد سے ایک لاکھ تیرہ ہزار ٹیکس اکٹھا ہوتا تھا اور یہ اس مرکزی شاہرہ پہ واقع ایک ضلعی ہیڈ کوارٹر تھا جو کہ ملتان صوبہ کو جھنگ، شاہ پور، جہلم، جموں سے ملاتی تھی۔

حافظ آباد اور سکھا شاہی

مغل اقتدار کے اختتام کی طرف بڑھنا شروع ہوا تو ۱۷۶۵ء میں سکھوں نے لاہور پہ قبضہ کر لیا کیونکہ گرو گوبند سنگھ جو کہ سکھوں کے آخری گرو تھے نے سکھ قوم کو مسلوں میں بانٹ کر جتھے بنائے تاکہ پنجاب میں سکھا شاہی یعنی سکھ راج قائم کیا جا سکے ان مسلوں میں آہلووالیا مسل، پھلکیاں مسل، رام گڑھیا مسل، سنگھ پوریا مسل، پنج گھڑہیا مسل، کہنیا مسل، نشان والیا مسل، نکئی مسل، شاہین دان مسل، دلے والیا مسل، بھنگی مسل اور سکھر چکیا مسل شامل تھی ان میں سے ایک بھنگی مسل تھی جو کہ بھنگ نامی بوٹی پینے والے سکھ سرداروں کی وجہ سے بھنگی مسل کہلائی۔ جس کی ابتدا ترن تارن ضلع امرتسر سے ہوئی۔ چھجا سنگھ پہلا بھنگ پینے والا گرو گوبند کا چیلہ تھا جس نے بھنگی مسل کی ابتدا کی اس کی موت کے بعد ایک اور بھنگی بھوما سنگھ بھنگی مسل کا سربراہ بنا اور اس کی موت کے بعد ۱۷۴۸ میں بھوما سنگھ کا منہ بولا بیٹا اور بھتیجا ہری سنگھ بھنگی مسل کا سربراہ بنا اور اس دوران اس مسل کے علاوہ دیگر مسلوں نے فتوحات کا سلسلہ پنجاب میں جاری رکھا اور جب ہری سنگھ فوت ہوا تو اس کی وفات کے بعد ۱۷۶۴ کے قریب اس کا جانشین اس کا بیٹا جھنڈا سنگھ ہوا جس نے ملتان فتح کیا اور ملتان سے واپسی پہ حافظ آباد پنڈی بھٹیاں کو ۱۷۷۳ میں فتح کرتے سیالکوٹ پہنچا جس کے جانے کے بعد حافظ آباد میں امن و امان کا دور ختم ہو گیا اور ایک نا ختم ہونے والا فتح شکست کا سلسلہ چل نکلا جھنڈا سنگھ جموں کی مہم میں مارا گیا تو اس کے بھائی گنڈا سنگھ کو بھنگی مسل کا سربراہ بنایا گیا اور گنڈا سنگھ کے وصال کے بعد ان کے بھائی چڑھت سنگھ کو بھنگی مسل کا جانشین چنا گیا حافظ آباد پہ سکھ اقتدار کی ابتدا جھنڈا سنگھ بھنگی نے کی اور

اسی دوران جب سنگھ پوریا مسل میں خانہ جنگی ہوئی تو گجرانوالہ کے قصبہ سکھر چک میں چڑھت سنگھ نامی سردار نے سکھر چکیہ مسل کے نام سے الگ مسل قائم کی سکھر چکیہ مسل کے بانی چڑھت سنگھ نوڑھ سنگھ کے بیٹے تھے نوڑھ سنگھ اوران کے والد بوڈھ سنگھ، سنگھپوریا مسل میں سردار تھے سکھر چک میں جب نوڈھ سنگھ کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے چڑھت سنگھ نے سنگھ پوریا مسل میں اپنا نام بنا چکے تھے انہوں نے سنگھ پوریا مسل میں اقتدار کی رسہ کشی دیکھتے اپنی الگ مسل کی بنیاد رکھی اور اپنے گاؤں سکھر چک کے نام سے اس مسل کا نام سکھر چکیہ مسل رکھا، چڑھت سنگھ کے خاندان میں سے کالو نامی جٹ ۱۴۷۰ میں پنڈی بھٹیاں سے ہجرت کر کے امرتسر کے علاقے سیہان سرن چلے گئے اور وہاں سے ہجرت کر کے وزیرآباد کے قریب ساند نامی علاقے میں چلے آئے اور بعد میں کالو کے بیٹے جادومان ہوئے جن کے بیٹے غالب عرف منو اسی جگہ آباد ہے اور پھر منو کے بیٹے کدو گجرانوالہ کے قریب خیالی اور خیالی سے سکھر چک میں آباد ہوئے اور پھر اسی نسل سے چڑھت سنگھ پیدا ہوئے اور مغلوں کے خلاف جنگوں کا آغاز کیا لاہور میں چڑھت سنگھ بھنگی اور چڑھت سنگھ سکھر چکیا نے کافی کامیاب حملے کیے اور راس وقت تک حافظ آباد کا اقتدار کبھی مغل اقتدار کے وفادار کھرل، چٹھہ اور بھٹی قبائل کو منتقل ہوتا تو کبھی بھنگی مسل کے سرداروں کو اور مغل اور سکھ سرداروں کی اقتدار کی لڑائی لاہور سے گجرانوالہ اور حافظ آباد زم زمہ توپ کی وجہ سے پہنچی۔ جب لاہور فتح ہوا تو سکھر چکیہ مسل کے مسل دار چڑھت سنگھ احمد شاہ ابدالی کی مرہٹوں کو تہس نہس کرنے والی مشہور زمانہ توپ زم مہ گجرانوالہ لے آئے جب احمد شاہ ابدالی نے سکھ مسلوں کو شکست دینے کے لیے ہندوستان پہ ۱۷۶۷ میں حملہ کیا تو وزیرآباد کے احمد خان چٹھہ زم زمہ توپ اپنے ساتھ احمد نگر لے آئے چڑھت سنگھ سکھر چکیہ نے حافظ آباد کی طرف لاہور پہ قبضہ کے بعد مارچ شروع کیا تو لاہور پہ احمد شاہ ابدالی کے گورنر خواجہ عابد خان ۱۷۶۱ میں پہلے بھاگ کر ایمن آباد آئے جہاں پر اس کی اپنی فوج میں شامل سکھ جتھوں نے جب بغاوت کر دی تو اس نے حافظ آباد کے رُخ کیا جہاں پہ رائے اسماعیل خان کھرل اور چودھری میاں خان چٹھہ نے پانچ سو سپاہی خواجہ عابد خان کے ہمراہ کیے اور گورنر لاہور خواجہ عابد خان کو شرق پور پہنچنے میں مدد کی جہاں سے اس نے دوبارہ لاہور پہ حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ کھرل اور چٹھہ قبائل کو سزا دینے کے لیے چڑھت سنگھ نے کھرل علاقوں پہ قبضہ کر کے بھاگ سنگھ ورک کو حاکم مقرر کیا جبکہ چٹھہ علاقوں پہ قبضہ کر کے اس علاقہ پہ منا سنگھ کو مقرر کر دیا چڑھت سنگھ سکھر چکیا کا جب ۱۷۷۴ میں انتقال ہوا تو اس کا جانشین اس کا بیٹا مہان سنگھ سکھر چکیا بنا جو رنجیت سنگھ کا باپ ہے اور دوسری طرف بھنگی مسل کے مرکزی سردار چڑھت سنگھ کا انتقال بھی اسی سال ہوا جس سال چڑھت سنگھ سکھر چکیا کا وصال ہوا۔ چڑھت سنگھ بھنگی نے اپنے بھتیجے دسو سنگھ کو بھنگی مسل کا سردار مقرر کیا۔ حافظ آباد میں مہان سنگھ سکھر چکیا نے ۱۷۸۲ میں دسو سنگھ بھنگی کو قتل کر دیا اور حافظ آباد پہ حکومت کی ابتدا کی جس کے مقابلہ میں یہاں کے مقامی مسلمان قبائل جن میں کھرل، بھٹی، تارڑ نمایاں تھے لڑتے رہے۔ اسی دوران احمد خان چٹھہ کے بڑے بھائی پیر محمد نے بڑا بھائی ہونے کے ناطے احمد خان سے توپ کا مطالبہ کیا انکار پہ جنگ ہوئی اور پیر محمد نے بھنگی مسل

کے گجرات پر اگنہ کے سردار گجر سنگھ بھنگی سے اپنے بھائی کے خلاف مدد طلب کی اور بدلے میں زم زمہ توپ گجر سنگھ بھنگی گجرات لے گیا جس نے بعد میں یہ توپ چڑہت سنگھ سکھر چکیا کو تحفہ میں گجرانوالہ بھجوادی جس پر چٹھہ قبائل کی سکھوں سے لڑائیوں میں توپ پہ قبضہ اعزاز بنا رہا اور توپ چٹھہ قبیلہ کی فتح کی وجہ سے ایک بار پھر احمد نگر آ گئی اور منچر قلعہ میں رکھوائی گئی۔ مہمان سنگھ نے زم زمہ لینے کے لیے چٹھہ قبیلہ سے لڑائیاں کیں چونکہ چٹھہ قبیلہ کے کچھ دیہات حافظ آباد میں بھی ہیں تو مہمان سنگھ کی جنگوں نے اسے حافظ آباد کی راہ دیکھائی جو کہ اس وقت بھنگی مسل کے سکھ سرداروں کے پاس تھا مہمان سنگھ اپنے والد کے برعکس بھنگی سکھوں . پہ تری کا قائل تھا جس نے بھنگی مسل گجرات پر اگنہ کے سکھ سردار گجر سنگھ کے بیٹے اور اپنے بہنوئی صاحب سنگھ (جن کے نام پہ قلعہ صاحب سنگھ ہے) کو لاہور پہ حملہ پہ اُکسایا اور اس کے بعد اپنے باپ کے خلاف بغاوت پہ آمادہ کیا اور اس کے بعد مہمان سنگھ نے احمد خان چھٹھہ پہ حملہ کیا تو احمد خان نے گجر سنگھ کے پاس پناہ لی لیکن مہمان سنگھ نے صاحب سنگھ کو ورغلا کر احمد خان کو اغوا کیا اور بعد میں شہید کر دیا جس کہ بعد بھنگی مسل اور مہمان سنگھ کی سکھر چکیا مسل کے درمیان اعتماد ختم ہو گیا اس کے بعد مہمان سنگھ نے حافظ آباد اور پنڈی بھٹیاں کے علاقے بھنگی مسل کے حافظ آباد پر اگنہ سے ۱۷۸۲ میں قبضہ میں لے لیے جب کہ کچھ علاقے بھنگی مسل میں شامل رہے جب ۱۷۸۸ میں گجر سنگھ فوت ہوا تو صاحب سنگھ بھنگی مسل کے گجرات پر اگنہ کا سربراہ بنا اور مہمان سنگھ نے صاحب سنگھ پر حملہ کر کے اس کا اقتدار گجرات کے انواع سے ختم کر دیا مہمان سنگھ چھبیس سال کی عمر میں بخار سے ۱۷۹۰ میں فوت ہوا تو رنجیت سنگھ دس سال کا تھا جس نے اپنے باپ کی فتوحات کو آگے بڑھایا۔ مہمان سنگھ کی موت کے بعد حافظ آباد کے علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں اور سکھ قوم کو مقامی تین بڑے مسلم قبائل کھرل، تارڑ اور بھٹیوں نے نکال باہر کیا۔

رنجیت سنگھ اپنے باپ مہان سنگھ کی وفات کے بعد چٹھہ قبیلہ کے سردار جان محمد بن غلام محمد کو شکست دے کر رام نگر (موجودہ شہر رسول نگر) فتح کرنے میں کامیاب ہوا اور جان محمد کابل پناہ گزین ہوئے اور رنجیت سنگھ کو لاہور میں مصروف دیکھ جان محمد چٹھہ کابل سے زمان شاہ کی مدد سے دوبارہ اپنے علاقوں کو سکھوں سے آزاد کروانے میں کامیاب ہوئے اور منچر چھٹہ کو اپنا مستقر بنایا آخر کار ۱۷۹۹ اور ۱۸۰۰ میں لاہور فتح کر کے رنجیت سنگھ بذات خود لاہور کا محاذ چھوڑ کر واپس پلٹا اور منچر چٹھہ کو تہس نہس کرتا چٹھہ قبائل پہ قابو پانے میں کامیاب ہوا اور جان محمد چٹھہ اس مرتبہ میدان جنگ میں شہید ہوئے اس کے فوری بعد رنجیت سنگھ حافظ آباد وارد ہوا اور حافظ آباد کے جملہ علاقوں کو فتح کرتا چلا گیا قلعوں کے باہر کھرل، تارڑ اور بھٹی قبائل نے رنجیت سنگھ کا ڈٹ کر تین سال تک مقابلہ کیا اور بڑی تعداد میں ان قبائل سے لوگ شہید ہوئے رنجیت سنگھ کی افواج فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے آگے بڑھتی چلی گئیں اور رنجیت سنگھ کے جرنیل سردار فتح سنگھ آلووالیا نے افواج کو مغرب کی طرف بڑھا دیا اور حافظ آباد میں سے صرف جلالپور بھٹیاں اور پنڈی بھٹیاں میں بھٹی قبائل نے مضبوط قلعہ بندیوں کی وجہ سے مزاحمت جاری رکھی۔

اور آخر کار گھمسان کی جنگ ہوئی کئی بھٹی قبیلہ کے مردان شہید ہوئے اور باقی ماندہ ایک ایک کر کے جھنگ کی طرف

۱۸۰۲ میں سیال قبیلہ کی پناہ میں پسپا ہوئے۔ اور رنجیت سنگھ نے حافظ آباد پنڈی بھٹیاں کا علاقہ سردار فتح سنگھ آلووالیا کے سپرد کیا اور اگلے پچاس سال تک یہ علاقے سکھوں کی عمل داری میں تاریخ کا سفر طے کرتے چلے گئے۔

بھٹی اور کھرل قبائل کی رسہ کشی

پنڈی بھٹیاں سے چوہدری رحمت خان بھٹی نے رنجیت سنگھ سے صلح کر لی جس کی بڑی وجہ گوگیرہ کے کھرل قبائل کا بڑھتا اثر رسوخ تھا کیونکہ جب بھنگی مسل کے سکھ سرداروں نے کھرل قبائل سے ٹیکس لینے میں سختی کی تو کھرل قبائل نے وسیر اور واہگا قبائل پہ سختی کر دی جو کہ کھرل قبائل کے علاقوں میں کاردار تھے جنہوں نے بھاگ کر سکھ ورک قبیلہ کے پاس پناہ لی۔ کیونکہ ورک سردار گربخش سنگھ ورک نے وزیرآباد کے کچھ علاقوں پہ قبضہ کرنے کے بعد حافظ آباد کے کچھ علاقوں کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا جب بھنگی مسل سے اقتدار پھسلتے سکھر چکیا مسل کو منتقل ہونا شروع ہوا تو ورک سکھ قبائل نے مغرب کی طرف سے حافظ آباد کے علاقوں پہ اجارہ داری بڑھانے میں وسیر اور واہگا قبائل کو استعمال کیا جنہوں نے بھٹی قبائل کے بار کے علاقوں پہ حملے شروع کر دیئے اور جب بھٹی قبائل نے بار کے علاقوں میں مداخلت روکنے کی کوشش کی تو وسیر اور واہگا قبائل نے گوگیرہ میں احمد خان کھرل سے مدد مانگی جو کہ بار میں اپنا اثر رسوخ بڑھانے کا خواہشمند تھا لہٰذا بھٹی اور کھرل قبائل بار کے علاقوں میں حالت جنگ میں آ گئے۔ لیکن مہمان سنگھ سکھر چکیہ کے کھرل اور بھٹی قبائل میں مسلسل حملوں نے عارضی جنگ بندی کا کام کیا اور گوگیرہ میں احمد خان کھرل کی سکھ پیش قدمی روکنے کی کوششوں نے بھٹی اور کھرل قبائل کی بار کے علاقوں میں جنگ کو لگام ڈال دی۔ لیکن رحمت خان بھٹی کی جھنگ سے پنڈی بھٹیاں واپسی نے ایک بار پھر سے احمد خان کھرل کی سرکردگی میں جاری جدوجہد آزادی کے دوران کھرل اور بھٹی قبائل کو مدمقابل کھڑا کر دیا۔ اور یہ کش مکش اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ احمد خان کھرل نے بھی اپنے قبائل کے عمائدین کے ہمراہ فقیر رضا عزیزالدین کے کہنے پہ اس شرط پہ رنجیت سنگھ سے صلح کر لی کہ علاقہ میں مکمل عملداری ان ہی کی رہے گی۔ اور ۱۸۳۴ میں یہ صلح مکمل ہوئی۔ حافظ آباد رنجیت سنگھ کی حکومت میں تحصیل کا درجہ رکھتا تھا رنجیت سنگھ حکومت کے آٹھ صوبے لاہور، جالندھر، کانگڑا، جموں کشمیر، پشاور، وزیرآباد اور ملتان تھے حافظ آباد لاہور صوبہ کے پراگنہ (اضلاع)، لاہور، امرتسر، گجرانوالہ، سیالکوٹ، دینانگر، گوگیرہ اور شیخوپورہ میں سے گجرانوالہ کا حصہ تھا اس وقت گجرانوالہ کے چار تعلقہ جات (تحصیلیں) تھیں گجرانوالہ، شرق پور، خانقاہ ڈوگراں اور حافظ آباد۔

حافظ آباد کے سکھ جاگیردار

دوسری سکھ جنگ ۱۸۴۸ تا ۱۸۴۹ تک یا تو باقی مقامی مسلمان قبائل جلاوطن رہے یا غیر ملکی قرار دے دیئے گئے دوسری سکھ جنگ کے بعد یہ قبائل اپنے تباہ حال علاقوں کی طرف پلٹے اور تھوڑی بہت تبدیلیوں کے بعد انگریز سرکار کی بڑھتی عملداری

کو سکھ مخالفت میں قبول کیا تا کہ اپنے گھر علاقے جائیدادیں واپس لے سکیں جن سے سکھ قوم نے ان کو بے دخل کر دیا تھا انگریز سرکار نے جاگیروں، جائیدادوں کو وراثتی قانون میں تبدیل کیا تو مقامی قبائل نے سکھا شاہی کی بجائے انگریز سرکار کا ساتھ دیا۔ حافظ آباد کے علاقوں کو سکھوں نے آٹھ جاگیروں میں تقسیم کر رکھا تھا جن میں سے حافظ آباد جاگیر اٹھاون دیہات پہ مشتمل تھی اور یہ جاگیر رولہ رام نے کھرل، تارڑ اور بھٹی سے حاصل کی اور یوں حافظ آباد کے پہلے سکھ جاگیر دار کا نام رولہ رام تھا رولہ رام کے منشی بابا ماہو سنگھ تھے جو اس جاگیر سے مالیہ یعنی ٹیکس اکٹھا کرتے تھے۔ دوسری جاگیر جلالپور تھی جس میں بائیس دیہات تھے اور یہ جاگیر دیوان ساون مل نے کھرل اور بھٹی مسلمان قبائل سے حاصل کی اور یوں جلالپور کے پہلے سکھ جاگیر دار دیوان ساون مل تھے جبکہ تیسری جاگیر جانگلہ تھی جس میں پانچ دیہات تھے، یہ جاگیر بھی دیوان ساون مل نے کھرل، اور بھٹی مسلمان قبائل سے حاصل کی اور یوں جانگلہ جاگیر کے پہلے سکھ جاگیر دار دیوان ساون مل تھے۔ چوتھی جاگیر پنڈی بھٹیاں تھی جس میں تیرانوے دیہات تھے اور یہ جاگیر بھی دیوان ساون مل نے بھٹی اور کھرل مسلمان قبائل سے حاصل کی اور یوں دیوان ساون مل پنڈی بھٹیاں کے پہلے سکھ جاگیر دار تھے پانچویں جاگیر رام پور (موجودہ رسول پور تارڑ) تھی جس میں چوالیس دیہات تھے یہ جاگیر راجہ گلاب سنگھ نے تارڑ اور کھرل مسلمان قبائل سے حاصل کی اور یوں راجہ گلاب سنگھ رام پور جاگیر کے پہلے سکھ جاگیر دار تھے اور چھٹی جاگیر کولو تھی جس میں نو دیہات تھے اور یہ جاگیر رتن سنگھ نے تارڑ مسلم قبیلہ سے حاصل کی اور یوں کولو جاگیر کے پہلے سکھ جاگیر دار رتن سنگھ ہوئے اور ساتویں جاگیر ونیکے تھی جس میں تائیس دیہات تھے یہ جاگیر راجہ گلاب سنگھ نے تارڑ مسلمان قبیلہ سے حاصل کی اور یوں راجہ گلاب سنگھ ونیکے کے پہلے سکھ جاگیر دار تھے۔ آٹھویں جاگیر چک بھٹی تھی جو کہ اکیس دیہات پہ مشتمل تھی جس کو راجہ گلاب سنگھ نے بھٹی مسلم قبائل سے حاصل کیا گلاب سنگھ کو ایک بہتر جاگیر دار تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی جاگیروں میں نئے کنویں کھدوائے کھرل اور بھنگسیئں کے بھٹی قبائل کو نرم شرائط پہ زمین واپس کیں لیکن راجہ گلاب سنگھ کے منشی وزیر رتنو نے گلاب سنگھ کی عدم موجودگی میں سخت گیری کی اور بدنام ہوا ان جاگیر داروں میں دیوان ساون مل قابل ترین جرنیل اور جاگیر دار تھے جنہوں نے بہت نیک نامی کمائی۔ جب حافظ آباد بھنگی مسل سے سکھر چکیا مسل میں شامل ہوا تو راجہ رنجیت سنگھ نے حافظ آباد جاگیر کو رولہ رام سے جاگیر دار مول رام کو دے دیا اور راجہ رنجیت سنگھ نے جلالپور جاگیر کو دیوان ساون مل سے شاہدرہ کے جاگیر دار ٹھا کر داس کو دے دیا اور راجہ رنجیت سنگھ نے جانگلہ جاگیر کو بھی دیوان ساون مل سے لے کر جاگیر دار لونگا مل کو دے دیا اور پنڈی بھٹیاں اور رام پور (موجودہ رسول پور تارڑ) کی جاگیروں کو راجہ گلاب سنگھ سے نئے جاگیر دار وزیر رتنو کو دے دیا جو کہ اس سے پہلے راجہ گلاب سنگھ کے کاردار تھے اور رنجیت سنگھ نے کولو جاگیر کو رتن سنگھ سے عملی خان کو دے دیا جبکہ ونیکے جاگیر کو گلاب سنگھ سے لے کر وزیر رتنو کو دے دیا ان تمام جاگیروں کو رانجیت سنگھ نے دیوان ساون مل اکال گڑھیا (علی پور چٹھہ) کو ٹھیکہ پہ دے رکھا تھا جس نے رنجیت سنگھ سے حافظ آباد پنڈی بھٹیاں، جن کھرلاں، فرید آباد، جھنگ،

گڑھ مہاراجہ، ملتان، اکال گڑھ (علی پور)، سید والہ، کمالیہ، چنیوٹ، ڈیرہ غازی خان، رتن گھڑھ، امام شاہ، سردار پور کے علاقے ۱۸۳۴ تک تئیس لاکھ میں ٹھیکہ پہ حاصل کرر کھے تھے اسی دوران کیپٹن کلاڈ مارٹن واڈے دولت خان اور جلال خان بھٹی آف پنڈی بھٹیاں سے پریڈ معائینہ پہ ناراض ہوئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قربت کے پیش نظر شکائت کی جس پہ مہاراجہ نے دولت خان اور جلال خان بھٹی کو کیپٹن صاحب سے معذرت کرنے کا حکم دیا اور معذرت کے بعد جب شہزادہ نونہال سنگھ نے ۱۸۳۴ میں جب الائچی کا ٹھیکہ جلال خان بھٹی کو دیا تو مہاراجہ نے اس کے اوپر مزید شرائط کا اضافہ کیا۔ ۱۸۳۷ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے چار تعلقہ جات یعنی جلالپور، پنڈی بھٹیاں چنڈی یوٹ (چنیوٹ) اور جھنگ سیال کو سردار راجہ گلاب سنگھ کو ٹھیکہ پہ دے دیا جن میں سے زیادہ تر علاقے دیوان ساون مل کے پاس تھے۔ بارہ نومبر ۱۸۳۸ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ پنڈی بھٹیاں دورے پہ پہنچے جہاں سے اس نے مقامی عمائدین سے لاہور جانے کا مختصر راستہ پوچھا تو بتایا گیا کہ خانقاہ ڈوگراں سے سیدھے لاہور قریب تر رہے گا۔

حافظ آباد کے سکھ ذیل دار

۱۸۴۹ کے بعد حافظ آباد کو انگریز سرکار نے ان سکھ جاگیرداروں سے جنگ، جنگی دھمکیوں اور معاہدات کے ذریعے حاصل کیا اور گجرانوالہ کو ضلع قرار دیتے ہوئے تحصیل حافظ آباد تشکیل دی اور حافظ آباد تحصیل کو پانچ پراگنہ میں تقسیم کیا جن میں حافظ آباد کے علاوہ، شیخو پورہ، ونیکے، سکھیکی، پنڈی بھٹیاں شامل تھے۔ اور سات جاگیروں کے جاگیرداروں میں سے لونگا مل کو جانگلے اور پنڈی بھٹیاں جاگیر پہ برقرار رکھا جبکہ حافظ آباد جاگیر کو کہن چند، جلالپور اور کولو جاگیروں کو دت مل امرتسریہ اور چک بھٹی جاگیر دت مل آف چک بھٹی کے حوالے کیا اور رام پور (موجودہ رسول پور تارڑ) کو انگریزوں نے وزیر رتنو سے نانک چند جبکہ ونیکے کو وزیر رتنو سے امر چند کے حوالے کیا۔ اور ۱۸۶۷ میں جاگیرداری نظام ختم کر کے زیلداری نظام متعارف کروایا تو حافظ آباد کو پندرہ زیلوں میں تقسیم کیا جن میں کولو، کسوکی، حافظ آباد، کسیسے، ٹھٹھہ مانک، کھڑانی، جلالپور، پنڈی بھٹیاں، راسکے چٹھہ، ونیکے، کوٹ نکہ، رام پور (رسول پور) ساگر، سکھیکی اور نانوآنہ شامل ہیں۔

☆......☆
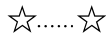
☆ اللہ سے معافی مانگو، یہ معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔

☆ جو شخص دستِ سوال دراز کرے اسے انکار نہ کرو۔

موسیقی

محمد صادق اختر بٹ (ریٹائرڈ پرنسپل)

موسیقی ایک پسندیدہ چیز ہے۔ ناپسندیدہ نہیں۔ یہ حقیقتاً روح کی غذا ہے۔ جسمانی بھوک لگے تو ہم کھانا کھا کر پیٹ بھرتے ہیں لیکن روحانی بھوک اور روحانی پیاس موسیقی سے تسکین پاتی ہے۔

موسیقی کا مطلب ہے بال کی کھال اُتارنا۔ یہ واقعی انتہائی باریک، نفیس اور لطیف فن ہے۔ روح بھی لطیف ہوتی ہے لہٰذا لطیف چیز کا لطیف چیز ہی سے تعلق ہے۔ موسیقی ایک انتہائی دقت طلب فن ہے۔ اسے سیکھنے میں عمریں بسر کر دی جاتیں ہیں۔ موسیقی سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے اندر موسیقیت ہونی چاہیے۔ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں جو کسی نہ کسی رنگ میں موسیقی پسند نہ کرتا ہو۔ اگر ہم ادراک رکھتے ہوں تو موسیقی برسات میں بھی ہے، قوس قزح میں بھی ہے، بھنور گھٹاؤں میں بھی ہے، چاند کی چاندنی میں بھی ہے، کسی پری پیکر کی چال میں بھی ہے، کسی حسین کے لہجے میں بھی ہے، آنکھ میں بھی ہے، لبوں پر بھی ہے، قد و قامت میں بھی ہے۔

موسیقی کیا ہے۔ روح میں بہتے جھرنوں کو سازوں کی مدد سے ایک پیکر عطا کر دینا۔ موسیقی پری پیکر ہے۔ اعلیٰ ترین موسیقی اداس موسیقی ہوتی ہے۔ جس میں حزن ہو۔ دکھ کی تان ہو۔ جو روح کو متاثر کرے جس سے وجدان حاصل ہو۔ موسیقی مجاز سے حقیقت تک پہنچانے کی سیڑھی ہے۔ اسے حیات انسانی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ حیات جسم ہے تو موسیقی اس کی روح ہے۔ ہماری اداسیوں، دکھوں اور غموں کا علاج ہے۔ ہم کتنے ہی اداس کیوں نہ ہوں، جب کسی حسیں کی مخلوطی انگلیاں ستار کے تاروں کو چھیڑتی ہیں تو روح کے تار بھی چھڑ جاتے ہیں۔ ہمارا صبر، اداسی اور حزن و ملال تحلیل ہو جاتے ہیں۔ وہیں ایک طرح سے ہمارا "CATHARASIS" کتھارسس ہو جاتا ہے۔ اندر کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ ہم ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔ موسیقی ہم پر "Ennobling effect" شریفانہ اثر ڈالتی ہے۔ ہمیں شریف، متین اور سنجیدہ بناتی ہے۔ اگر یہ کوئی ناپسندیدہ چیز ہوتی اور اس کا غیر شریفانہ "Ignobling effect" ہوتا تو عرب کے علاوہ برصغیر کے بڑے بڑے زعماء، صلحاء، قطب اور ولی اسے اپنی خانقاہوں اور درگاہوں میں نہ گھسنے دیتے۔

نبی پاک ﷺ جب مدینہ تشریف لاتے ہیں تو جوان بچیاں دف بجا کر ان کا استقبال کرتی ہیں۔ جناب ﷺ نے منع نہیں فرمایا۔ برصغیر کے سب سے بڑے موسیقار حضرت امیر خسرو تھے انہوں نے نہ صرف بہت سارے ساز ایجاد کیے بلکہ

بہت سارے راگ اور راگنیاں بھی ایجاد کیں۔ انہی راگ اور راگنیوں پر حقیقی موسیقی کی بنیاد ہے۔ کون کہتا ہے موسیقی ناجائز ہے۔ حضرت امیر خسرو اپنے پیر و مرشد نظام الدین اولیا کا سازوں کی لے پر نغمے اور گیت گا کر دل بہلایا کرتے تھے۔ موسیقی کی کئی اشکال ہیں ایک شکل اس کی قوالی بھی ہے۔ حضرت داتا صاحب کا دربار ہو یا بابا فرید صاحب کی خانقاہ ہو یا گولڑہ شریف کا پیر خانہ ہو، موسیقی ہی کی شکل میں سازوں کے ساتھ نعت اور حمد پڑھی جاتی ہے۔

موسیقی ہماری زندگی کا جزو اعظم ہے۔ یورپ میں موزارٹ (MOZART) اور بیتھون (BEETHOVEN) عظیم موسیقار گزرے ہیں۔ بیتھون نابینا تھا اس کی لافانی دھنیں آج بھی قلب و روح کو جکڑ لیتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں تان سین اور بیجو باورا عظیم ترین موسیقار تھے۔ تان سین جب راگ ملہار چھیڑتا تو ساری کائنات ہمہ تن گوش ہو کر اس کی سحر آگین دھنیں سنتیں۔ برصغیر میں زمانہ قدیم میں موسیقی کے ماہرین کو بطور خاص بادشاہ اور امراء اپنے درباروں سے وابستہ کرتے۔ یہ موسیقار باقاعدہ درباروں میں ملازم ہوتے۔ موسیقی کی عظیم الشان محافل برپا کی جاتیں۔ اکثر و بیشتر بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کو نیند لانے کے لیے بھی مختلف راگ سنائے جاتے، تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ موسیقی ناجائز یا ناپسندیدہ چیز نہیں۔ یہ ایک انتہائی دلفریب اور دلکش پہلو ہے۔ اس کائنات کا، اسے حیات انسانی سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اخراج کا مطلب ہے جسم سے روح نکال دینا۔ بڑے بڑے صوفیاء اور اولیاء نے اسی کے ساتھ مجاز سے چل کر حقیقت کو پایا۔ دنیا میں کوئی چیز ناپسندیدہ نہیں ہوتی اس کا ناپسندیدہ استعمال اسے ناپسندیدہ بنا دیتا ہے۔ موسیقی ہماری روح ہے، خوشبو ہے، قوس قزح ہے۔ حیات انسانی کا نچوڑ ہیں مکرر کہتا ہوں کہ موسیقی زندگی کا اہم حصہ ہے اس کے بغیر زندگی خشک و بنجر صحرا ہے۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے
نہ کوئی نغمہ ہے اور نہ کوئی ساز ہے
زندگی بس آواز ہی آواز ہے

☆......☆

☆ غیر مسلموں کے ساتھ مہربانی اور اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔
☆ خود کو لالچ سے بچاؤ۔

پرنسپل: پروفیسر الحاج محمد یونس جنجوعہ

ڈاکٹر رائے عمران خان کھرل
(لیکچرر سیاسیات)

کالج کو بطور ادارہ چلانے کے لیے پرنسپل کا کردار کلیدی ہوتا ہے۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج ضلع حافظ آباد کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے جس میں دستیاب سہولتوں سے اگر ٹھیک طرح سے فائدہ اُٹھایا جائے تو یہ ادارہ صوبائی سطح پہ توجہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس کالج کے موجودہ پرنسپل استاد محترم الحاج محمد یونس جنجوعہ نے اگست دو ہزار سترہ میں جب اس ادارہ کا چارج سنبھالا تو عین وہی صورتحال درپیش تھی جو پاکستان میں حکومت تبدیل ہونے پہ نئی حکومت کو درپیش ہوتی ہے۔ کالج کے جملہ گزٹڈ اور نان گزٹڈ سٹاف کو جہاں توقعات تھیں وہیں خدشات بھی تھے کیونکہ پرنسپل کی کرسی اگر کسی سٹاف ممبر کو ملے تو آغاز مختلف طرح سے ہوتا ہے اگر پرنسپل کی کرسی کسی اور کالج یا ضلع سے تشریف لائی شخصیت کو ملے تو آغاز لازماً اور طرح سے ہوتا ہے۔ سابق پرنسپل کی ریٹائرمنٹ کے بعد پہلے سے موجود سٹاف میں سے ہی موجودہ پرنسپل صاحب اس کرسی پر تشریف فرما ہوئے تو سبھی گزٹڈ اور نان گزٹڈ سٹاف ان کی طبیعت سے واقف تھا جس چیز نے جہاں کئی آسانیاں پیدا کیں وہیں کئی پریشانیوں کو بھی جنم دیا۔

ان فروعی چیزوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے جب ان کی بطور پرنسپل تین سال سروس مکمل ہو رہی ہے کچھ ادارہ ہذا کے لیے خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرکب ہے انسان کی زندگی کے اختتام پہ دی گئی آخری گواہی اس کا سرمایہ ہوتا ہے اور جب بات حکمران یا صاحب اقتدار کی ہو تو اس کا حساب اس کی خامیوں کو خوبیوں سے تول کر کیا جاتا ہے اگر سو خامیوں کے ساتھ ایک سو ایک خوبیاں ہوں تو کامیاب قرار دیا جائے گا۔ اگر کہیں کسی کی شخصیت میں ہمیں کسی کوتاہی کا ملال زیادہ ہو رہا ہو تو اپنی شخصیت میں موجود خامیوں پہ نظر دوڑانے سے آفاقہ ہو جایا کرتا ہے۔ پروفیسر الحاج محمد یونس جنجوعہ نے کالج ہذا کے لیے چند خدمات سرانجام دی ہیں جن کا تذکرہ کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کس طرح سے سوچ کا صرف زاویہ تبدیل کرنے سے ایک درست چلتے نظر آتے نظام میں بہتری پیدا کی جا سکتی ہے اور کیسے ہمیشہ ہر جگہ بہتری کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ کالج کے نظام میں چونکہ طلبہ سب سے اہم حصہ ہیں تو پرنسپل صاحب نے طلبہ کی بہتری کے لیے طلبہ کو ہر ممکن سہولت دینے کی کوشش کی۔ اساتذہ کرام کو ہمیشہ طلبہ کی مدد کی تلقین کی خود ہمیشہ طلبہ کو یقین دلاتے نظر آئے کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔ طلبہ کی فیس میں جہاں تک ہو سکا ان کی مدد کی، کلاسز کا بروقت اجرا کیا سٹاف کی کمی کو غیر روایتی طریقہ سے والنٹیئر اساتذہ کی خدمات حاصل کر کے پورا کیا۔ سائنس لیبارٹریز میں پریکٹیکل کا نظام دیا اور اکیڈمک کلینڈر کے عین مطابق سائنسی نمائشوں

کا شاندار اجرا کیا، کمپیوٹر لیب کے لیے نئے کمپیوٹر خرید کیے اور پرانے سسٹم درست کروائے، اور کمپیوٹر لیب میں الگ انٹرنیٹ سسٹم لگوا کر دیا۔ لائبریری کو ڈویژن بھر میں پہلی ڈیجیٹل لائبریری بنایا، اور انٹرنیٹ سے منسلک کیا اور لائبریری میں چالیس ہزار ای بکس کا اضافہ کیا اب لائبریری میں موجود کتب کو انٹرنیٹ سے سرچ کیا جا سکتا ہے اور چالیس ہزار کتب کو نیٹ پر پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ کی حاضری کا ماہانہ ریکارڈ رکھا جانے لگا ہے اور کالج کے اندرونی امتحانات کا آن لائن ریکارڈ ترتیب دیا جا رہا ہے۔ کالج میں گنجائش کی کمی کے باوجود سالانہ اڑھائی سو طلبہ کا اضافی داخلہ ممکن کیا اور اس وقت طلبہ کی تعداد انٹر، ڈگری اور ماسٹر لیول تک تین سالوں میں اٹھارہ سو سے بڑھ کر ساڑھے ستائیس سو تک جا پہنچی ہے۔

علاوہ ازیں علاقہ کے طلبہ کی مشکلات کو سمجھتے ہوئے ادارہ میں بی ایس پروگرام کا آغاز کروایا اور دو ڈسپلنز میں بی ایس اکنامکس اور بی ایس پولیٹیکل سائنس کا اجرا کیا۔ جس میں باقاعدہ کلاسز ہو رہی ہیں کالج میں سالوں سے دو ڈیپارٹمنٹس سٹور کی حیثیت دے کر بند کر دیئے گئے تھے جہاں ایک طرف فرنیچر تباہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف کلاس روم کی کمی کا سامنا تھا موجودہ پرنسپل پروفیسر الحاج محمد یونس جنجوعہ نے ان ڈیپارٹمنٹس کو کھلوایا اور ان میں سے ایک کو پولیٹکل سائنس اور دوسرے کو اُردو ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کیا گیا اور طلبہ کو وہاں تک رسائی دے کر کلاس رومز کی کمی کی شدت کم کی علاوہ ازیں اکیڈمک بلاک کے روم سترہ اور اٹھائیس سالوں سے بند تھے جن کو سٹور قرار دے کر بند کر دیا گیا تھا ان کی طرف توجہ دیتے ان کمروں کو کلاس رومز کا درجہ دے کر کھلوایا گیا آج ان میں باقاعدگی سے طلبہ کلاسز لے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں کالج ہذا اس ضلع کا سب سے بڑا ادارہ ہے جہاں ایک عدد ملٹی پرپز حال تو موجود ہے لیکن بریفنگ اور میٹنگ کے لیے ایک عدد کانفرنس روم کی شدید ضرورت تھی جس کے لیے پرنسپل صاحب نے بصیرت کا مظاہرہ کرتے روم نمبر گیارہ کو ورلڈ کلاس کانفرنس روم میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور کمرہ نمبر گیارہ میں جدید ٹائلنگ، سلینگ اور وائرنگ کروا کے نئے دس عدد ٹیبلز اور پچاس عدد آرام دہ کرسیوں سے مزین کیا اور نئے کھڑکیاں دروازے لگا کر ایک ورلڈ کلاس کانفرنس روم سے کالج کو مزین کیا ہے جو کہ آنے والے سالوں میں ایک خدمت کے طور یاد رکھا جائے گا طلبہ کو صاف پانی کی سہولت کو حل کرنے کے لیے دو عدد نئے واٹر کولر نصب کروائے اور پہلے سے خراب تین واٹر کولر درست کروا کر نصب کروائے اور جملہ واٹر کولرز کے ساتھ الگ الگ فلٹر لگوائے علاوہ ازیں کالج میں دو عدد ہینڈ پمپ خراب تھے جن کو درست کروایا اور دو عدد نئے بور اور ہینڈ پمپ نصب کروائے اور ایک عدد نئے بور کے ساتھ موٹر اور ٹینک کا بندوبست کیا جو کہ کالج گیٹ پہ نصب ضروریات پوری کرتا نظر آتا ہے جس میں کالج ہذا کے مخیّر اساتذہ کرام کا کردار شاندار ہے اللہ ان کے اجر میں اضافہ فرمائے۔

کالج کی مسجد کی طرف توجہ دیتے مسجد میں بہترین قسم کا قالین ڈلوایا اور ایک حصہ میں ٹائل لگوائی۔ کئی سالوں سے بند اقبال آڈیٹوریم کے بند اے سی سروس اور درستگی کے بعد چلوائے۔ سٹاف روم میں سٹاف کی خدمت کرتے ایک عدد اے سی کا

اضافہ کیا۔کلریکل دفاتر میں ٹائل لگوائی، وائس پرنسپل آفس کواہمیت دیتے ہوئے ٹائل لگوائی پردے لگوائے، صوفہ سیٹ اور اے سی لگوا کر دیا اور اپنے دفتر میں نئے پردے، لگوائے سالوں سے خراب صوفے مرمت کروائے اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح، شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کی شایان شان تصاویر پہلی دفعہ لگوائیں اور اس سائز کی تصاویر سٹاف روم، مختلف دفاتر میں لگوائیں۔ پرنسپل آفس میں قومی اور کالج پرچم لگوائے اقبال آڈیٹوریم کے سامنے قومی اور کالج پرچم لگوائے۔

کالج میں طلب کی روزمرہ کی شکایات کے حل کے لیے سٹوڈنٹ افیریز کے نام سے ایک دفتر کا اضافہ کیا اور اس کے علاوہ کالج کی مکمل وائرنگ بجلی اور گیس درست کروائی اور سینٹری کا نظام جو تباہ حال تھا درست کرایا اور بیس سے زائد بند واش روم درست کروائے سب سے بڑھ کر وزیراعظم عمران خان کے ویژن کے عین مطابق جہاں سابقہ ادوار میں اس کالج میں درخت کٹوائے جاتے رہے ہریالی ختم ہورہی تھی پندرہ سو نئے درخت اور پودے لگوا کر ہریالی میں اضافہ کیا۔ واٹر فلٹر پلانٹ کی وائرنگ کروادی گئی کسی مخیرّ صاحب حیثیت کا انتظار کہ پلانٹ مہیا کیا جاسکے۔ مسئلہ کشمیر کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے ایک پلاٹ کا نام کشمیر لان اور مقبوضہ جونا گڑھ جسے قوم بھول چکی کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے ایک پلانٹ کا نام جونا گڑھ لان رکھا جہاں پہ ان پاکستان کی مقبوضہ ریاستوں کے نام کے بورڈ نصب کروائے اور پرچم قومی پرچم کے ساتھ لہرادیئے گئے ہیں۔

کالج ہذا کے میگزین پہ توجہ کی تو ''الحفیظ'' کے نام سے ایک میگزین سالانہ جاری تھا جس کے نام کی تعلیمی توجیہہ سمجھنا مشکل تھا لہٰذا اس میگزین کا نام ''الحفیظ'' سے ''اثر'' رکھا گیا جو آرٹس اینڈ سائنس ریویو کا انگریزی زبان میں مخفف ہے جس کو ایک علمی نام شمار کیا جاسکتا ہے۔ عصر نام سے یہ پہلا شمارہ ہے علاوہ ازیں بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ریسرچ جنرل کی اشد ضرورت کو مدنظر رکھتے ایک عدد نئے انگریزی ریسرچ جنرل ''گزٹ'' کے نام سے اجرا کروایا جارہا ہے جو آنے والے سالوں میں اس ضلع کے پڑھے لکھے طبقہ کی علمی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد دے گا۔ آنے والے سالوں میں پرنسپل پروفیسر الحاج محمد یونس جنجوعہ کی خدمات ان شاء اللہ جاری رہیں گی جن کو اگر ممکن ہوا تو ان کی ریٹائرمنٹ پہ ایک نئے مضمون میں گنوانے کی کوشش کی جائے گی۔

☆......☆

☆ مذہب میں رہبانیت نہیں۔

☆ اللہ علم والوں کو مقدم رکھتا ہے۔

☆ برائی کو اچھائی سے ختم کرو۔

کتاب سے دوستی لگائیے

پروفیسر محمد اسلم بیگ (اسلام آباد)

کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ قرآن پاک میں اللہ رب العزت کی حمد وثنا (سورۃ فاتحہ) اور الٓـمٓ کے بعد پہلے پارہ کے سب سے پہلے دو الفاظ کون سے ہیں؟

ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ یہ کتاب ہے۔

اور پھر خود اللہ رب العزت نے اس کتاب کی خوبیاں بیان کی ہیں کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں اور یہ ہدایت کا سرچشمہ ہے۔قرآن پاک میں ''کتاب'' کا لفظ 232 مرتبہ آیا ہے۔بحثیت مسلمان کتاب ہمارا ایمان بھی ہے اور ہمارا اثاثہ بھی۔ویسے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام تشریف لا چکے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے صرف چار برگزیدہ انبیائے کرام کو کتاب جیسی نعمت سے نوازا اور پھر ان انبیائے کرام تک اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب کیسے پہنچائی؟ فرشتوں کے سردار اور اپنے سب سے مقرب فرشتے حضرت جبرائیلؑ امین کے ذریعے۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا کہ مَیں تمہارے لیے دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ایک کتاب اور ایک میری سنت۔ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے کتاب کی کتنی اہمیت ہے! ہمارے عظیم مفکرین نے ماضی میں دینی اور سائنسی علوم کی اشاعت کے لیے بے شمار کتابیں تحریر کیں۔لیکن آج غیروں کی منصوبہ بندی کے مطابق ہمارے ہاں ٹی وی، موبائیل، انٹرنیٹ اور فیس بک نے کتاب کی جگہ لے لی ہے۔سوشل میڈیا نے بچوں سے اُن کا بچپن چھین لیا ہے۔نامناسب باتیں دیکھنے اور سیکھنے کی وجہ سے اُن کی معصومیت غائب ہوگئی ہے۔سوچ اور اعمال میں نمایاں تبدیلیاں آ چکی ہیں۔چنانچہ معاشرے میں برائیوں اور جرائم کی تعداد اور شدت خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔

موبائیل فون بنیادی طور پر آلہ گفتگو یا آلہِ پیغام رسانی تھا۔لیکن ہم نے اسے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔اور تو اور ہم نے اسے آلہ تلاوت اور آلہ عبادت کا درجہ بھی دے دیا ہے۔یہ منظر مساجد میں بھی نظر آنے لگا ہے کہ قرآن پاک کے اتنے زیادہ نسخے موجود ہونے کے باوجود ہمارے مسلمان بھائی موبائیل پر قرآن پاک کی تلاوت کر رہے ہوتے ہیں۔سفر اور مجبوری میں تو پھر بھی ٹھیک ہے لیکن کتابی صورت میں قرآن پاک موجود ہونے کے باوجود اسے چھوڑ کر موبائیل سے تلاوت کرنا مناسب نہیں ہے۔اس میں وہ مزا اور وہ روحانیت نہیں ہے جو قرآن پاک کے نسخے سے تلاوت کر کے حاصل ہوتی ہے۔

حالیہ سروے کے مطابق پاکستان میں صرف 27 فیصد لوگ کتب بینی کے شوقین ہیں جب کہ 73 فیصد نے کتاب بینی سے دوری کا اعراف کیا ہے۔اسی لیے جناب سعود عثمانی کو مایوسی کے عالم میں کہنا پڑا:

کاغذ کی یہ مہک، یہ نشہ روٹھنے کو ہے
یہ آخری صدی ہے کتابوں سے عشق کی

مایوسی کی اس کیفیت سے ہم تبھی نکل سکتے ہیں جب ہم کتاب کو اس کا اصل مقام دیں گے۔ الیکٹرانک میڈیا کی چکا چوند سے متاثر اور مرعوب ہونے کی بجائے ہم کتابوں سے اپنا تعلق جوڑیں تو بہت جلد ہمارے دل سے آواز آئے گی کہ:

سرورِ علم ہے کیفِ شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے بہتر

کتابیں انسان کی بہترین دوست ہی نہیں بلکہ معلومات کا ذریعہ اور خزانہ بھی ہوتی ہیں۔ صاحبِ ذوق لوگ دن میں بھی کتاب کو زیرِ مطالعہ رکھتے ہیں اور رات کو بھی اُس وقت تک سوتے نہیں ہیں جب تک کسی کتاب کے چند صفحات سے استفادہ نہ کرلیں۔ اگر سونے سے پہلے کسی کتاب کی ورق گردانی سے محروم رہ جائیں تو اُن کی کیفیت یوں ہوتی ہے۔

جب کتابوں سے میری بات نہیں ہوتی ہے
تب میری رات میری رات نہیں ہوتی ہے

کتابوں سے دوستی رکھنے والا شخص کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ کتاب اُس وقت بھی ساتھ دیتی ہے جب تمام دوست اور پیار کرنے والے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق اچھی کتابیں شعور کو جلا بخشتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ بچوں اور بڑوں کو بہت سے فضول مشغلوں سے بھی بچاتی ہیں۔

جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ کتابوں کا مطالعہ، لکھنے کا عمل اور ذہن پر زور دینے والی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے ہر عمر کے افراد کا حافظہ قوی ہوتا ہے اور یادداشت مضبوط ہوتی ہے اور بچپن سے بڑھاپے تک ذہنی یادداشت برقرار اور محفوظ رہتی ہے۔ مطالعہ کرنے والے لوگوں کا دماغ دوسروں کے مقابلے میں 32 فیصد زیادہ یادداشت اور حافظہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔

موبائیل بنانے والوں نے بڑی ہوشیاری سے اسے ''کتابی چہرہ'' دے کر کتاب کا نعم البدل بنانے کی کوشش کی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ایک جیسی شکل کی وجہ سے نقل کو اصل کہا جا سکتا ہے۔

☆......☆
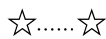
روحانی بصیرت

ماخذاز ''سرالاسرار'' (سیدنا غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

محمد سلیم صدیقی (اسسٹنٹ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں جو کامل قدرت وحکمت اور بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے اور کروڑوں ہا درود وسلام نبی کریم ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل اطہار و بزرگی والے اصحاب پر آمین!

''سرالاسرار'' (رازوں کے راز) کتاب کو کلمہ طیبہ کے 24 حروف رات دن کے چوبیس گھنٹوں کی تعداد کے مطابق لطافت میں بیان کیا گیا ہے۔ چند ایک لطائف باذوق ولطافت پسندوں کی نظر:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نور جمال سے سب سے پہلے روح محمد ﷺ کو پیدا فرمایا۔ فرمان خداوند کریم **''خلقت روح محمد ﷺ من نوروجھی''** (روح محمد ﷺ کو میں نے اپنے چہرے کے نور سے پیدا فرمایا) اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی آنکھ مبارک کے نور سے عرش کو پیدا فرمایا اور پھر عرش سے کائنات کو پیدا فرمایا۔

ہم اس برباد ہونے والی دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آئے بلکہ اطاعت خداوندی کرنے اور نفس خبیث کی خواہشات کو ختم کرنے آئے ہیں۔ (آزمائش)

علم کی دو اقسام، علم ظاہر (علم شریعت) وعلم باطن (علم معرفت) ہیں انہیں سیکھ کر ہمیں اپنے وطن واپسی کی تیاری کرنا ہے۔ ہمارا کام دنیا میں ہمیں بتا دیا گیا ہے۔ ''و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون'' (الذاریات۔56)، (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا) پس کامیاب واپسی کے لیے معرفت قلب کا ہونا ضروری ہے اور (اللہ تعالیٰ کی) معرفت، قلب (باطن) کے آئینہ سے نفس کے پردے کو دور کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے وہ کچھ حاصل ہوتا ہے جو انسانی دماغ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس وجود تک رسائی ابتدائی طور پر توبہ وتلقین اور کلمہ طیبہ کے زبانی ذکر سے اور قلب کے زندہ ہو جانے پر دل کی زبان سے ہے۔

درجات:
1- عالم ناسوت (عالم ملک/ جنت الماوی): ان لوگوں کے لیے جنہوں نے شریعت کے احکام پر اچھے طریقے سے رضائے الٰہی کے لیے عمل کیا، لیکن قرب الٰہی کی خواہش نہ کی۔
2- عالم ملکوت (جنت نعیم): ان لوگوں کے لیے جنہوں نے زائد عبادات درود و وظائف کے ذریعے عالم ناسوت کی قید سے نجات حاصل کر لی اور تصوف کے اصولوں کو اپناتے ہوئے خواہشات نفس سے کسی حد تک چھٹکارا حاصل کر لیا۔
3- عالم جبروت (جنت الفردوس): ان لوگوں کے لیے جنہوں نے مزید طریقت کے احکام پر عمل کر کے (تزکیہ نفس و تصفیہ قلب) فرشتوں جیسی نورانیت حاصل کر کے عالم جبروت تک رسائی حاصل کر لی۔

4- عالم قر: بحدیث قدسی "**الانسان سری و انا سرہ**"o (انسان میرا راز ہے اور میں انسان کا راز ہوں) یہ خاص مقام ان لوگوں کے لیے، جنہوں نے روحانی پاکیزہ اعمال کے ذریعے قرب الٰہی کے لیے جدوجہد کی جس کے نتیجے میں ان کی روح، جسمانی خواہشات پر غالب آ گئی اور اسے عالم قرب میں لے گئی اور یہ سب سے اعلیٰ قرب (مراتب) میں سے ایک ہے۔

شرعی مسائل میں تفکر کا ایک لمحہ، ایک سال کی عبادت سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجوب (واجب/عبادت) میں تفکر کا ایک لمحہ ستر سال کی عبادت سے افضل اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی معرفت میں تفکر کا ایک لمحہ ہزار سال کی عبادت سے افضل ہے۔

کرامت (اللہ کا راز) کو ظاہر کرنا کفر ہے۔ پس جو اس (مقام) سے گزر جاتا ہے وہ باقی مقامات کو حاصل کر لیتا ہے۔ ورنہ کام ہو جاتا ہے "**لیس کمثله شی ء**" **و هو السمیع البصیر** " (الشوریٰ۔11)، (اس کی مثل کوئی شے نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے)۔

جب انسان اپنے مقصود (اللہ تبارک وتعالیٰ) کو پا لیتا ہے تو عقلیں چکرا جاتی ہیں قلوب حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ زبانیں بند ہو جاتی ہیں اور انسان میں ہرگز استطاعت (طاقت/ہمت) نہیں رہتی کہ وہ کسی کو اس مشاہدہ سے باخبر کر سکے۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مثال سے پاک ہے۔

علم ظاہر و باطن ہر دو کی بارہ اقسام ہیں۔ لیکن عوام وخواص کی صلاحیت وقابلیت کے پیش نظر ان کو چار ابواب (شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے علم وعمل سے انسان اپنی حقیقت تک رسائل حاصل کر سکتا ہے، پس جب تک انسان زیادہ کھانے پینے سونے، فضول گوئی اور وحشیانہ عادات (غضب، گالی گلوچ، مار پیٹ، غصہ) شیطانی صفات (تکبر، عجب، حسد، کینہ، بری عادات) سے پاک ہو کر گناہوں سے توبہ حقیقی نہیں کرتا وہ ان علوم ومراتب کو نہیں پا سکتا۔

"بے شک اللہ توبہ کرنے والوں سے اور پاکیزہ لوگوں سے محبت کرتا ہے۔" (البقرہ۔222)

"**فاذکرو الله قیاما و قعودا و علیٰ جنوبکم**" (النساء۔103 ()) پس اللہ کا ذکر کرو کھڑے، بیٹھے اور پہلوؤں کے بل لیٹے ہوئے)۔

ذکر زبان: اس میں قلب (وہ) ذکر کرتا ہے جس ذکر سے وہ اللہ تعالیٰ کو بھول چکا ہوتا ہے۔

ذکر نفسی: یہ حروف اور آواز کے بغیر، پردہ قلب میں حس وحرکت سے سنا جاتا ہے۔

ذکر قلب: اس میں قلب اپنے ضمیر (باطن) میں اللہ تعالیٰ کا جلال وجمال ملاحظہ کرتا ہے۔

ذکر روح: اس میں (اللہ تعالیٰ کی) صفات کے انوار وتجلیات کا مشاہدہ ہے۔

ذکر سر: وہ مرتبہ جس میں اسرار الٰہیہ منکشف ہوتے ہیں۔

ذکر خفی: اس میں عظیم قدرت والے رب کے پاس، صدق کی مجلس میں ذات احدیت کے جمال کے انوار کا دیدار ہے۔

ذکر اخفی الخفیٰ: اس میں حق الیقین کی حقیقت کو اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ اس پر حق تعالیٰ کے سوا کوئی بھی مطلع نہیں ہوتا۔

درج بالا علم معرفت بابت حضور علیہا الصلوۃ والسلام کا فرمان مبارک ہے۔ ''جسے علم (یعنی علم معرفت) کی طلب میں موت آئے گی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی قبر میں دو فرشتے متعین فرمائے گا جو اسے قیامت تک معرفت کا علم سکھاتے رہیں گے اور جب وہ اپنی قبر سے اُٹھے گا تو وہ عالم اور عارف ہو گا۔''

حدیث قدسی میں فرمایا گیا ''میں ایک مخفی خزانہ تھا پس میں نے ارادہ کیا کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پیدا فرمایا تاکہ وہ مجھے پہچانیں۔''

انسان کو یہ مراتب موت سے قبل اپنی نفسیات اور بشریت کو فنا کر لینے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

دراجات	عالم	علوم	ارواح	تجلیات	عقول	جنت
1	عالم ملک (دنیا)	علم شریعت	روح جسمانی	تجلی آثار	عقل معاش	جنت ماویٰ
2	عالم ملکوت	علم طریقت	روح نورانی	تجلی افعال	عقل معاد	جنت نعیم
3	عالم جبروت	علم معرفت	روح سلطانی	تجلی صفات	عقل روحانی	جنت فردوس
4	عالم لاہوت	علم حقیقت	روح قدسی	تجلی ذات	عقل کل	جنت قرب/حقیقت

ہمیں عالم لاہوت (حقیقت) سے عالم ملک (دنیا) میں آزمائش کے لیے بھیجا گیا اور واپسی کا رستہ بھی بتا دیا گیا۔

اب ہمیں سوچنا اور تفکر کرنا ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہے، کس طرح جانا ہے اور ہم کہاں جا رہے ہیں؟

اس دنیا میں دنیاوی نظام کے ساتھ ساتھ ایک روحانی نظام بھی رائج ہے۔ جس تک رسائی کے لیے ہمیں تعلقیت و تجریدیت کی اصطلاحات کو سمجھنا/ جاننا انتہائی ضروری ہے۔

بقول اقبال: مجھے فرشتہ نہ کہو اس سے میری تحقیر ہوتی ہے ۔۔۔ میں مسجود ملائک ہوں مجھے بندہ ہی رہنے دو

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی معرفت اور وصال کے لیے پیدا فرمایا، پس انسان کے لیے واجب ہے کہ دونوں جہانوں میں وہ چیز طلب کرے جس کے لیے اس کو پیدا فرمایا گیا ہے۔

''و ما من دابة فی الارض الا علی الله رزقها''

حدیث قدسی: ''انا عند الظن عبدی بی فلیظن لی ماشاء ''(میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں اب وہ جو چاہے میرے ساتھ گمان کرے) ۔۔۔ و ما توفیق الا با اللّٰہ

نوٹ: اگر مذکورہ بالا مضمون تھوڑا سا بھی پر کشش لگے تو بغور دو مرتبہ ضرور پڑھیں، آپ کے ایمان کو چار چاند لگ جائیں گے بصورت دیگر دوبارہ مت پڑھیں اپنے ایمان و آخرت کی فکر ضرور کریں۔

علم ریاضی

ریحان یونس جنجوعہ
(پی۔ایچ۔ڈی سکالر)

مقدار، ڈھانچے، حجم، تبدیلی اور نقشے وغیرہ کے مطالعے کو علم الحساب یا ریاضی کا علم کہتے ہیں۔ اسے آپ ضروری حساب کتاب کا سائنسی علم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس حساب کتاب میں گنتی اور پیمائش، دو بنیادی عمل ہوتے ہیں۔ ان میں ہندسے اور نقطے اہم علامات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ علم الحساب میں اشکال اور حرکات کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

علم الحساب اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود بنی نوع انسان۔ عملی ریاضی کو قبل از تاریخ کے لوگ بھی استعمال کرتے تھے۔ ان لوگوں کی ریاضی اتنی اچھی تھی کہ وہ غیر مادی چیزوں مثلاً دنوں، موسم اور سالوں وغیرہ کا حساب بھی رکھتے تھے۔ تاہم آغاز میں لوگ اشیا کو شمار کرنے کے لیے دھاگوں، رسیوں اور کنکر وغیرہ کو استعمال کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ گنتی کا نظام سب سے پہلے وادیِ سندھ کے لوگوں نے متعارف کرایا تھا۔ ابتدا میں ریاضی کو صرف تجارت کے مقصد اور اراضی کی پیمائش کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

جدید دور میں اس علم کا استعمال سائنسی اور غیر سائنسی تمام میدانوں میں ناگزیر ہو چکا ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں پائے جانے والے ہر تعلیمی ادارے میں بچوں کو بنیادی جماعتوں ہی سے ریاضی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ حالیہ دور میں اَن پڑھ لوگ بھی ہندسوں اور سادہ جمع تفریق کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک ایسا عملی علم ہے، جس کی ہر انسان کو ہر قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔ اگر کسی شخص کو گنتی نہیں آتی، تو اسے زندگی کے ہر ہر موڑ اور ہر ہر قدم پر دوسروں کی مدد کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔

کیمیا، طبیعیات، فلکیات، ارضیات اور حیاتیات ہو یا لسانیات اور ادبیات، علم الحساب ہر جگہ کسی نہ کسی اساسی صورت میں موجود رہتا ہے۔ یہ علم اتنی وسعت اختیار کر گیا ہے کہ اسے مزید کئی قسموں اور شاخوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ جیسا کہ ریاضی، عملی ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، ٹریگنومیٹری، شماریات اور کمپیوٹر سائنس وغیرہ۔

ریاضی کے علم کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے، اس کے ارتقا اور اس کی ترقی میں مسلمان ریاضی دانوں کا بڑا اہم اور شان دار کردار رہا ہے۔ مثال کے طور پر محمد بن موسیٰ خوارزمی اور عمر خیام نے الجبرا اور لوگرتھم ایجاد کیا۔ لوگرتھم ایسا علم ہے جو

موجودہ کیلکو لیٹر اور کمپیوٹر میں بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ البیرونی نے ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادن خان کے مقام پر بیٹھ کر زمین کا قطر دریافت کیا۔ اگر ماضی کے بڑے ریاضی دانوں کے نام لیے جائیں تو ان میں فیثا غورث، عمر خیام، محمد بن موسیٰ خوارزمی، البیرونی، جمشید الکاشی، ولیم ردرفورڈ، آئن سٹائن اور آئزک نیوٹن وغیرہ شامل ہیں۔

تمام علوم میں ریاضی کے وسیع استعمال کی بدولت اسے ''تمام سائنسی علوم کی ماں'' اور ''تمام سائنسی علوم کی ملکہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علم آج کل کے زمانے میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ تمام حساب کتاب مشینی ہو جانے کی وجہ سے انسان کو طویل رقوم یاد نہیں رکھنا پڑتیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارا کام بالکل ختم ہو گیا ہے البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جدید دور کے طلبہ کے لیے کیلکو لیٹر اور کمپیوٹر کی سہولتوں کی بنا پر علم الحساب آسان اور تیز تر ہو گیا ہے۔ تاہم اس کے لیے نہ صرف کیلکو لیٹر اور کمپیوٹر کے استعمال میں تربیت یافتہ ہونا لازمی ہے بلکہ ریاضی کے قواعد اور قوانین پر عبور اور دسترس ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

ریاضی علم کے ساتھ ساتھ دلچسپ کھیل بھی ہے۔ آیئے آپ کو ریاضی کے چند کھیل بتائیں کہ کس طرح یہ علم کھیل میں بھی ہماری معاونت کرتا ہے:

۲۵۹ اور ۳۹ دو ایسے حیران کن اعداد ہیں کہ آپ ان دونوں کو ضرب دے کر ان کے حاصلِ ضرب کو کسی بھی عدد سے ضرب دیں تو اس کا جواب تین بار وہی ہو گا جس سے ۲۵۹ اور ۳۹ کے حاصلِ ضرب کو ضرب دی گئی ہو گی۔

مثلاً: آپ کی عمر ۱۰ سال ہے تو آپ پہلے ۲۵۹ کو ۳۹ سے ضرب دیں اب اس حاصلِ ضرب کو ۱۰ سے پھر ضرب دیں۔ تو اس کا جواب کچھ یوں آئے گا ۱۰۱۰۱۰۔ اسی قاعدے کے مطابق آپ سب کی عمروں کا حساب کر کے دوستوں کو حیران کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

کوئی بھی عدد لیں۔ اس کو چار گُنا کریں، اس حاصلِ ضرب میں دو جمع کریں اور پھر اسے پانچ سے ضرب دیں۔ حاصلِ ضرب کو بیس سے تقسیم کریں جو باقی بچے اسے نو سے ضرب دیں۔ حاصلِ ضرب میں دو جمع کریں جواب ہمیشہ ۹۲ ہو گا۔

اگر بحساب ابجد نبی کریم ﷺ کے اسم مبارک محمد ﷺ کے اعداد لیے جائیں تو ان کا مجموعہ ۹۲ ہوتا ہے۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کی ذات تمام جہانوں کے لیے رحمت اور سراپا ہدایت ہے اس لیے ہر چیز یا شخص کے نام کے اعداد اسی نامِ مبارک کے اعداد کے گرد گھومتے ہیں۔
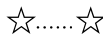
☆ فیصلے مشاورت کے ساتھ کیا کرو۔
☆ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں۔

باپ کی عظمت کا ایک اہم واقعہ

ڈاکٹر وردہ یونس

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے باپ کی شکایت کی کہ یا رسول اللہ ﷺ میرا باپ مجھ سے پوچھتا نہیں اور میرا سارا مال خرچ کر دیتا ہے۔
آپ ﷺ نے ان کے والد محترم کو بلوایا،
جب ان کے والد کو پتا چلا کہ میرے بیٹے نے رسول اللہ ﷺ سے میری شکایت کی ہے تو دل میں رنجیدہ ہوئے۔
اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لیے چلے۔
چونکہ عرب کی گھٹی میں شاعری تھی۔
تو راستے میں کچھ اشعار ذہن میں کہتے ہوئے پہنچے۔
ادھر بارگاہ رسالت میں پہنچنے سے پہلے حضرت جبرائیلؑ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا۔
کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان کا معاملہ بعد میں سنیئے گا پہلے وہ اشعار سنیں جو وہ سوچتے ہوئے آ رہے ہیں۔
جب وہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا۔
کہ آپ کا مسئلہ بعد میں سنا جائے گا پہلے وہ اشعار سنایئے جو آپ سوچتے ہوئے آئے ہیں۔
وہ مخلص صحابی تھے۔
یہ سن کر وہ رونے لگے...... کہ
جو اشعار ابھی میری زبان سے ادا بھی نہیں ہوئے، میرے اپنے کانوں نے ابھی نہیں سنے......
آپ کے رب نے وہ بھی سن لیئے......
اور آپ ﷺ کو بتا بھی دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ کیا اشعار تھے۔
ہمیں سنائیں۔
ان صحابی نے اشعار پڑھنا شروع کیے۔
(آپ کو ان کا آسان ترجمہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ جو اشعار تھے اور جس اعلیٰ پائے کے تھے اور جو جذبات

کی کیفیت تھی، ان کی صحیح ترجمانی اُردو میں مشکل ہے بہر حال اشعار کچھ اس طرح سے تھے کہ)

اے میرے بیٹے!

جس دن تو پیدا ہوا۔

ہماری محنت کے دن تبھی سے شروع ہو گئے تھے۔

تو روتا تھا، ہم سو نہیں سکتے تھے۔

تو نہیں کھاتا تو ہم کھا نہیں سکتے تھے۔

تو بیمار ہو جاتا تو تجھے لیئے لیئے کبھی کسی طبیب کے پاس علاج معالجے کے لیے مارے مارے پھرتے تھے کہ کہیں تجھے کچھ ہو نہ جائے۔

کہیں مر نہ جائے۔

حالانکہ موت الگ چیز ہے اور بیماری الگ چیز ہے۔

پھر تجھے گرمی سے بچانے کے لیے میں دن رات کام کرتا رہا۔

کہ میرے بیٹے کو ٹھنڈی چھاؤں مل جائے۔

ٹھنڈ سے بچانے کے لیے میں نے پتھر توڑے۔

تغاریاں اُٹھائیں کہ میرے بچے کو گرمی مل جائے۔

جو کمایا تیرے لیے۔

جو بچایا تیرے لیے۔

تیری جوانی کے خواب دیکھنے کے لیے میں نے دن رات اتنی محنت کی کہ اب میری ہڈیاں تک کمزور ہو گئی ہیں لیکن تو کڑیل جوان ہو گیا ہے۔

پھر......

مجھ پر خزاں نے ڈیرے ڈال لیے لیکن تجھ پر بہار آ گئی......

میں جھک گیا۔

تو سیدھا ہو گیا۔

اب میری خواہش اور اُمید پوری ہوئی۔

کہ اب تو ہرا بھرا ہو گیا ہے۔

چل اب زندگی کی آخری سانسیں تیری چھاؤں میں بیٹھ کر۔

گزاروں گا۔

مگر یہ کیا کہ جوانی آتے ہیں۔

تیرے تیور بدل گئے......

تیری آنکھیں ماتھے پر چڑھ گئیں......

تو ایسے بات کرتا ہے کہ جیسے میرا سینہ پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

تو ایسے بات کرتا کہ کوئی غلام سے بھی ایسے نہیں کرتا۔

پھر۔

میں نے اپنی ساری زندگی کی محنت کو جھٹلا دیا کہ

میں تیرا باپ نہیں نوکر ہوں......

نوکر کو بھی کوئی ایک وقت کی روٹی دے ہی دیتا ہے......

تو نوکر سمجھ کر ہی مجھے روٹی دے دیا کر......

یہ اشعار سناتے سناتے ان کی نظر اللہ کے رسول ﷺ کے چہرہ مبارک پر پڑی تو دیکھا کہ آپ ﷺ اتنا روئے کہ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک تر ہو گئی۔

آپ ﷺ میں اپنی جگہ سے اُٹھے اور بیٹے کا گریبان پکڑ کر فرمایا کہ۔

انت و مالک لابیک

تو اور تیرا سب کچھ تیرے باپ کا ہے۔

تو اور تیرا سب کچھ تیرے باپ کا ہے۔

تو اور تیرا سب کچھ تیرے باپ کا ہے۔

(تفسیر قرطبی)

اللہ کریم سے دعا ہے۔

رب ارحمهما کمار بیانیی صغیرا

☆......☆

دو پراٹھے

خرم شہزاد (سینئر لیکچرار اسسٹنٹ)

ابونصر الصیاد نامی ایک شخص، اپنی بیوی اور ایک بچے کے ساتھ غربت وافلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنی بیوی اور بچے کو بھوک سے نڈھال اور بلکتا روتا گھر میں چھوڑ کر خود غموں سے چور کہیں جار ہا تھا کہ راہ چلتے اس کا سامنا ایک عالم دین احمد بن مسکین سے ہوا، جسے دیکھتے ہی ابونصر نے کہا، اے شیخ میں دکھوں کا مارا ہوں اور غموں سے تھک گیا ہوں۔

شیخ نے کہا میرے پیچھے چلے آ ؤ، ہم دونوں سمندر پر چلتے ہیں۔

سمندر پر پہنچ کر شیخ صاحب نے اُسے دو رکعت نفل نماز پڑھنے کو کہا، نماز پڑھ چکا تو اُسے ایک جال دیتے ہوئے کہا اسے بسم اللہ پڑھ کر سمندر میں پھینکو۔

جال میں پہلی بار ہی ایک بڑی ساری عظیم الشان مچھلی پھنس کر باہر آ گئی۔ شیخ صاحب نے ابونصر سے کہا، اس مچھلی کو جا کر فروخت کرو اور حاصل ہونے والے پیسوں سے اپنے اہل خانہ کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان خرید لینا۔

ابونصر نے شہر جا کر مچھلی فروخت کی، حاصل ہونے والے پیسوں سے ایک قیمے والا اور ایک میٹھا پراٹھا خریدا اور سیدھا شیخ احمد بن مسکین کے پاس گیا اور اسے کہا کہ حضرت ان پراٹھوں میں سے کچھ لینا قبول کیجیے۔ شیخ صاحب نے کہا اگر تم نے اپنے کھانے کے لیے جال پھینکا ہوتا تو کسی مچھلی نے نہیں پھنسنا تھا، میں نے تمہارے ساتھ نیکی گویا اپنی بھلائی کے لیے کی تھی نا کہ کسی اُجرت کے لیے۔ تم یہ پراٹھے لے کر جاؤ اور اپنے اہل خانہ کو کھلاؤ۔

ابونصر پراٹھے لیے خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اُس نے راستے میں بھوکوں ماری ایک عورت کو روتے دیکھا جس کے پاس ہی اُس کا بیحال بیٹا بھی بیٹھا تھا۔ ابونصر نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پراٹھوں کو دیکھا اور اپنے آپ سے کہا کہ اس عورت اور اس کے بچے اور اُس کے اپنے بچے اور بیوی میں کیا فرق ہے، معاملہ تو ایک جیسا ہی ہے، وہ بھی بھوکے ہیں اور یہ بھی بھوکے ہیں۔ پراٹھے کن کو دے؟ عورت کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو اس کے بہتے آنسو نا دیکھ سکا اور اپنا سر جھکا لیا۔ پراٹھے عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا یہ لو، خود بھی کھاؤ اور اپنے بیٹے کو بھی کھلاؤ۔ عورت کے چہرے پر خوشی اور اُس کے بیٹے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ابونصر غمگیں دل لیے واپس اپنے گھر کی طرف یہ سوچتے ہوئے چل دیا کہ اپنے بھوکے بیوی بیٹے کا کیسے سامنا کرے گا؟ گھر جاتے ہوئے راستے میں اُس نے ایک منادی والا دیکھا جو کہہ رہا تھا، ہے کوئی جو اُسے ابونصر سے ملا دے۔ لوگوں نے

منادی والے سے کہا یہ دیکھو تو، یہی تو ہے ابونصر۔ اُس نے ابونصر سے کہا، تیرے باپ نے میرے پاس آج سے بیس سال پہلے تیس ہزار درہم امانت رکھے تھے مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ ان پیسوں کا کرنا کیا ہے۔ جب سے تیرا والد فوت ہوا ہے میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں کہ کوئی میری ملاقات تجھ سے کرا دے۔ آج میں نے تمہیں پا ہی لیا ہے تو یہ لو تیس ہزار درہم، یہ تیرے باپ کا مال ہے۔ ابونصر کہتا ہے، میں بیٹھے بٹھائے امیر ہو گیا۔ میرے کئی کئی گھر بنے اور میری تجارت پھیلتی چلی گئی۔ میں نے کبھی بھی اللہ کے نام پر دینے میں کنجوسی نا کی، ایک ہی بار میں شکرانے کے طور پر ہزار ہزار درہم صدقہ دے دیا کرتا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر رشک آتا تھا کہ کیسے فراخدلی سے صدقہ خیرات کرنے والا بن گیا ہوں۔ ایک بار میں نے خواب دیکھا کہ حساب کتاب کا دن آن پہنچا ہے اور میدان میں ترازو نصب کر دیا گیا ہے۔ منادی کرنے والے نے آواز دی ابونصر کو لایا جائے اور اُس کے گناہ وثواب تولے جائیں۔

کہتا ہے، پلڑے میں ایک طرف میری نیکیاں اور دوسری طرف میرے گناہ رکھے گئے تو گناہوں کا پلڑا بھاری تھا۔ میں نے پوچھا آخر کہاں گئے ہیں میرے صدقات جو میں اللہ کی راہ میں دیتا رہا تھا؟

تولنے والوں نے میرے صدقات نیکیوں کے پلڑے میں رکھ دیئے۔ ہر ہزار ہزار درہم کے صدقہ کے نیچے نفس کی شہوت، میری خودنمائی کی خواہش اور ریا کاری کا ملمع چڑھا ہوا تھا جس نے ان صدقات کو روئی سے بھی زیادہ ہلکا بنا دیا تھا۔ میرے گناہوں کا پلڑا ابھی بھی بھاری تھا۔ میں رو پڑا اور کہا، ہائے رے میری نجات کیسے ہو گی؟

منادی والے نے میری بات کو سنا تو پھر پوچھا، ہے کوئی باقی اس کا عمل تو لے آؤ۔

میں نے سنا ایک فرشتہ کہہ رہا تھا ہاں اس کے دیئے ہوئے دو پراٹھے ہیں جو ابھی تک میزان میں نہیں رکھے گئے۔ وہ دو پراٹھے ترازو پر رکھے گئے تو نیکیوں کا پلڑا اُٹھا ضرور مگر ابھی نا تو برابر تھا اور نا ہی زیادہ۔

منادی کرنے والے نے پھر پوچھا، ہے کچھ اس کا اور کوئی عمل؟ فرشتے نے جواب دیا ہاں اس کے لیے ابھی کچھ باقی ہے۔ منادی کرنے والے نے پوچھا وہ کیا؟ کہا اُس عورت کے آنسو جسے اس نے اپنے دو پراٹھے دیئے تھے۔

عورت کے آنسو نیکیوں کے پلڑے میں ڈالے گئے جن کے پہاڑ جیسے وزن نے ترازو کے نیکیوں والے پلڑے کو گناہوں کے پلڑے کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ ابونصر کہتا ہے میرا دل خوش ہوا کہ اب نجات ہو جائے گی۔

منادی کرنے والے نے پوچھا ہے کوئی کچھ اور باقی عمل اس کا؟

فرشتے نے کہا، ہاں، ابھی اس بچے کی مسکراہٹ کو پلڑے میں رکھنا باقی ہے جو پراٹھے لیتے ہوئے اس کے چہرے پر آئی تھی۔ مسکراہٹ کیا پلڑے میں رکھی گئی نیکیوں والا پلڑا بھاری سے بھاری ہوتا چلا گیا۔ منادی کرنے والا بول اُٹھا یہ شخص نجات پا گیا ہے۔ ابونصر کہتا ہے، میری نیند سے آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنے آپ سے کہا، اے ابونصر آج تجھے تیرے بڑے بڑے صدقوں نہیں بلکہ ''آج تجھے تیری دو روٹیوں نے بچا لیا۔''

قوت مدافعت

آیان علی
ایم۔اے (سال دوم)

ایمیون سسٹم یعنی قوت مدافعت قدرت کا ایک ایسا تحفہ ہے جو ہمارے جسم کا بیماریوں کے خلاف دفاع کرتا ہے اور جسم میں داخل ہونے والے جراثیموں کو بیماری پیدا کرنے سے خودکار طریقے سے روکتا ہے، اگر ہمارا ایمیون سسٹم طاقتور ہے تو بہت سی عام بیماریاں جیسے نزلہ، زکام، کھانسی وغیرہ خود بخود بغیر دوائی کھائے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔لیکن اگر ایمیون سسٹم کمزور ہے تو معمولی بیماری بھی بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔

1- ہلدی

ہمارے تقریباً سبھی سالن اس مصالحے کے بغیر نہیں پکائے جاتے یہ جہاں ان میں خوبصورت رنگ اور ذائقہ دیتی ہے وہاں اسے صدیوں سے بطور اینٹی اینفلا میٹری (سوزش ختم کرنے والی) دوا کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، یہ جوڑوں کے درد کے لیے انتہائی مفید چیز ہے اور اس کے اندر شامل طاقتور اینٹی بیکٹیریل خوبیاں بہت سے جراثیموں سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا خاتمہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ہلدی ہماری قوت مدافعت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

2- لہسن

بہت سی خوبیوں کا حامل لہسن بیماریوں کے خلاف ایک اکسیر کا درجہ رکھتا ہے اور جہاں بلڈ پریشر، دل، ذیابطس جیسی بیماریوں میں اس کا استعمال مفید ہے وہاں اس کے اندر شامل سلفر ہماری قوت مدافعت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

3- ادرک

ادرک ایک سبزی بھی ہے اور ایک مصالحہ بھی اور بہت سی بیماریوں سے لڑنے کے لیے ایک پُر اثر دوا بھی ہے جو نزلہ، زکام، کھانسی، سوزش، گلا خراب اُلٹی، متلی اور نظام ہضم کی بیماریوں کے ساتھ اور بہت سے امراض میں انتہائی مفید ہے۔

ادرک بھی لہسن کی طرح کولیسٹرول کم کرنے میں انتہائی معاون ثابت ہو سکتا ہے اور جسم کی دردوں میں اس کا استعمال درد سے راحت کا باعث بنتا ہے اور ان خوبیوں کے ساتھ ادرک ہمارے نظام دفاع کو مضبوط بناتا ہے کیونکہ اس میں بھی اینٹی بیکٹیریل خوبیاں شامل ہیں۔

4- سٹرس فروٹس

سمجھدار لوگ نزلہ زکام کھانسی وغیرہ میں عام طور پر وٹامن سی کا استعمال زیادہ کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ وٹامن سی خون میں سفید خلیوں کا اضافہ کرتا ہے جو انفیکشن کے خلاف لڑنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

سٹرس فروٹس جیسے کینو مالٹا مسمی لیموں چکوترہ وغیرہ وٹامن سی بھرپور کھانے ہیں اور یہ وٹامن ہمارے جسم میں سٹور نہیں ہوتا لہٰذا اسے روزانہ کھانے کی ضرورت ہے اور یہ وٹامن ہمارے ایمیون سسٹم کو مضبوط بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

5- دہی

دہی کی خوبیوں سے تقریباً سبھی واقف ہیں کیونکہ یہ ہماری صحت پر بہت سے اچھے اثرات مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری قوت مدافعت کو بڑھانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

دہی کا استعمال کرتے وقت دھیان رکھیں گے سادہ ہی استعمال کریں اور دہی کو میٹھا کرنے کے لیے چینی وغیرہ کی جگہ تازہ فروٹس جیسے کیلا، سٹابری اور شہد وغیرہ کا استعمال کریں۔

6- پالک

پالک وٹامن سی سے بھرپور ہونے کے ساتھ بہت سے دوسرے وٹامنز اور منرلز بھی ہمارے جسم کو مہیا کرتی ہے اور اس کا شمار بیٹا کیروٹین و تجیٹیبل میں ہوتا ہے جو آنکھوں کی صحت کے لیے انتہائی مفید ہے۔

پالک ہمارے جسم کو انفیکشنز سے لڑنے کی صلاحیت دیتی ہے اور ہمارے قوت مدافعت کو مضبوط بناتی ہے اور پروٹین حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

7- پپیتا

پپیتا بھی وٹامن سی حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ وٹامن جلد، دل وغیرہ کے ساتھ ہمارے ایمیون سسٹم کو طاقتور بناتا ہے۔ پپیتا وٹامن سی کے ساتھ اپنے اندر پوٹاشیم، وٹامن بی اور فولیٹ جیسے وٹامنز اور منرلز بھی رکھتا ہے جو ہماری صحت کے لیے انتہائی مفید ہیں۔

8- گرین ٹی

سبز چائے اور عام استعمال ہونے والی چائے فلیونائیڈز سے بھرپور مشروب ہیں اور فلیونائیڈ ایک اینٹی آکسائیڈینٹ ہے اور خاص طور پر گرین ٹی میں ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جو ہمارے ایمیون سسٹم کو توانا بنانے میں انتہائی معاون کردار ادا کرتے ہیں۔

9- بروکلی

گوبھی کی نسل کی یہ سبزی جہاں پروٹین حاصل کرنے کے بڑا ذریعہ ہے وہاں بہت سے مفید وٹامنز جیسے اے، سی، ای کیساتھ اینٹی آکسائیڈینٹس اور فائبر سے بھرپور غذا ہے جو ہمارے جسم کے نظام دفاع کو مضبوط بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

10- سرخ شملہ مرچ

وہ لوگ جو وٹامن سی کو صرف سٹرس فروٹس میں تلاش کرتے ہیں اُن کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ سرخ شملہ مرچ میں سٹرس فروٹس سے دوگنا زیادہ وٹامن سی شامل ہے جو صرف ہمارے ایمیون سسٹم کو طاقتور نہیں کرتا بلکہ ہماری جلد کو تروتازہ رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

سرخ شملہ مرچ کا شمار بھی بیٹا کیروٹین وجیٹیبل میں ہوتا ہے اور یہ سبزیاں آنکھوں کو سورج کی نقصان پہنچانے والی شعاؤں سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

11- دار چینی

دار چینی بھی صرف ایک مزیدار مصالحہ نہیں ہے بلکہ میڈیکل سائنس کی بہت سی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ دل، ذیابیطیس، کولیسٹرول جیسی دائمی بیماریوں میں انتہائی مفید چیز ہے اور اس کے اندر شامل اینٹی اینفلا میٹری اور اینٹی آکسائیڈینٹس اجرا ہمارے ایمیون سسٹم کو طاقتور بناتے ہیں۔

12- امرود

ایسے پھل اور سبزیاں جن میں وٹامن سی بڑی مقدار میں شامل ہو ہمارے نظام دفاع کو مضبوط بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور امرود بھی وٹامن سی سے بھرپور پھل ہے جو ہماری صحت پر انتہائی اچھے اثرات مرتب کرتا ہے۔

13- شہد

شہد کی تعریف میں اگر پوری کتاب لکھی جائے تو وہ بھی کم ہے کیونکہ اس کے اندر اتنی خوبیاں ہیں جنہیں ابھی تک سائنس بھی پوری طرح سمجھ نہیں پائی۔ خالص شہد ہمارے ایمیون سسٹم کو طاقتور بنانے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی اور نظام دفاع کے ساتھ یہ اور بہت سی بیماریوں کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

14- زیتون اور اس کے پتے

رب کائنات نے زیتون کی قسم کھائی ہے اور کوئی شک نہیں کہ زیتون ایک اکسیر ہے اور صرف زیتون ہی نہیں اس کے

پتے بھی ہمارے جسم کے ایمیون سسٹم کو طاقتور بناتے ہیں کیونکہ اس کے پتے جسم پر حملہ کرنے والے وائرس کو غیر موثر کرنے کے ساتھ ساتھ مزید پھیلنے سے روکنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

15- کیلا

اس پھل کا ذکر بھی رب کائنات اپنی کتاب میں کرتا ہے اور اس کی خوبیوں میں بھی کوئی شک نہیں۔ کیلا پوٹاشیم اور میگنیشیم سے بھرپور غذا ہے جو دل اور سٹروک کے لیے انتہائی مفید منرلز ہیں۔

کیلا خون میں سرخ ذرات کو بڑھانے کا باعث بنتا ہے اور اس میں شامل وٹامن بی6 ہمارے ایمیون سسٹم کو طاقتور بناتا ہے۔

ایمیون سسٹم کو بہتر بنانے کے لیے مختلف پھل اور سبزیاں کھانا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے اور اس مقصد کے لیے کسی ایک پھل یا سبزی پر انحصار کرنا اور صرف اُسے ہی کھائے جانا اتنا فائدہ نہیں دیتا لہٰذا اپنی خوراک میں ان تمام چیزوں کو شامل کریں تاکہ بیماریوں کے خلاف لڑنے کی قوت پیدا ہو اور آپ صحت مند رہیں۔
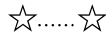
اچھی نصیحت

زندگی بدلنے کے لیے لڑنا پڑتا ہے۔۔۔! اور آسان کرنے کے لیے سمجھنا پڑتا ہے۔۔۔۔!

وقت آپ کا ہے، چاہو تو سونا بنا لو اور چاہو تو سونے میں گزار دو۔۔۔!

اگر کچھ الگ کرنا ہے تو بھیڑ سے ہٹ کر چلو۔۔۔!

بھیڑ ہمت تو دیتی ہے پر شناخت چھین لیتی ہے۔۔۔!

جب تک منزل نہ ملے تب تک ہمت مت ہارو اور نہ ہی ٹھہرو۔۔۔ کیوں کہ پہاڑ سے نکلنے والی نہروں نے آج تک راستے میں کسی سے نہیں پوچھا ''سمندر کتنی دور ہے''۔

☆۔۔۔۔☆

☆ اللہ شرک کے سوا تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔

☆ عورتیں اپنی زینت کی نمائش نہ کریں۔

حرکتیں نسلوں کا پتہ دیتی ہیں

محمد عثمان
(لیب سپروائزر شعبہ کیمسٹری)

☆ اگر آپ کسی ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے عام طور پر گھر پر چائے پینے کی نسبت زیادہ چینی ڈالتے ہیں یا ضرورت سے زائد کھانا ڈالتے ہیں تو آپ کے بدعنوان ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔

☆ اگر آپ پبلک واش روم میں گھر کی نسبت زیادہ ٹشو پیپر استعمال کرتے ہیں تو آپ کے اندر ایک چور چھپا بیٹھا ہے کہ اگر آپ کو کوئی موقع مل گیا تو آپ ضرور چوری کریں گے۔

☆ اگر آپ اپنی پلیٹ میں بھوک سے زیادہ کھانا محض اس لیے ڈالتے ہیں کہ اس کا بل کسی دوسرے جیب سے جا رہا ہے تو آپ فطرتاً لالچی ہیں۔

☆ اگر عام طور پر آپ قطار کو توڑ کر آگے جانے کی کوشش کرتے ہیں تو اگر آپ کو کوئی طاقتور عہدہ دیا جائے تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ آپ اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اُٹھائیں گے۔

☆ اگر عام طور پر ٹریفک جام میں آپ قطار توڑ کر دوسری گاڑیوں کے اندر گھسنے کی کوشش کرتے ہیں تو جب آپ کو کبھی سرکاری پیسے کا رکھوالا بنایا جائے تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ آپ اس میں غبن کے مرتکب ہوں گے کیونکہ آپ کو قوانین وضوابط پر عمل سے نفرت ہے۔

☆ اگر آپ اپنے گھر کے گندے پانی کا بہتر انتظام کرنے کی بجائے رُخ دوسرے کے گھر کی طرف کر دیتے ہیں یا گھر کا کوڑا گلی میں ڈال دیتے ہیں تو آپ کو معاشرتی آداب معلوم نہیں۔

☆ اگر آپ گھر اور آفس کی فالتو لائٹس بند کرنے کے عادی نہیں ہیں تو موقع ملنے پر آپ ملکی اور قومی وسائل کو بے دریغ ضائع کرنے کا ارتکاب کریں گے۔

☆ اگر آپ زیادہ تر کمپیوٹر اور موبائل پر گیمز کھیلتے ہیں تو آپ کاہل اور سست انسان ہیں اور آپ اپنی زندگی کو فضولیات میں ضائع کر دیں گے۔

☆ اگر آپ طالب علم ہیں اور امتحان کی تیاری صرف امتحان سر پر آنے پر کرتے ہیں تو آپ بددیانت، کاہل اور کام چور

ہیں اور آپ اپنے ساتھ ساتھ اپنے والدین، معاشرہ اور قوم کے بھی دشمن ہیں۔

☆ اگر آپ کا زیادہ وقت کہانیاں پڑھنے، فلمیں اور ڈرامے دیکھنے میں گزرتا ہے تو آپ خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والے، بے عمل اور نکمے انسان ہیں جو اپنے علاوہ لواحقین اور دوست احباب کا مستقبل بھی برباد کررہے ہیں۔

☆ اگر آپ لوگوں کی خامیاں تلاش کرتے ہیں۔ اور اچھائیوں کو نظر انداز کرتے ہیں تو آپ فطرتاً ایک بیچ انسان ہیں جسے لوگوں کو نیچا دکھانا مقصود ہے۔

☆ آیئے جہاں بھی ہمیں موقع ملے ہم خود باکردار انسان بننے کی کوشش کریں۔ یہ زندگی عطیہ خداوندی ہے اور قوم کی امانت ہے۔ اس میں خیانت ہرگز نہ کریں اللہ کریم ہم سب کا حامی و ناصر ہو......(آمین)

☆......☆

اچھی بات

مولوی صاحب، مردے کو غسل دیتے ہوئے اس کے بیٹے سے بولے، آپ کے والد صاحب کی جرسی اور کپڑے نئے ہیں، قینچی سے نہیں کاٹتے، آپ بعد میں استعمال کر لینا، بیٹا، مولوی صاحب سے بولا "بھلا مردے کی اترن بھی کوئی پہنتا ہے"۔

مولوی صاحب بولے: بیٹا، مردے کا بینک بیلنس، چمکتی گاڑی، عالی شان محل وہ تو سب استعمال کرو گے ناں؟؟؟

یادرکھیں:

جس اولاد کے لیے آپ آج اپنا تن من دھن فراموش کرکے کماتے چلے جارہے ہیں، وہ اولاد آپ کے اترے کپڑے پہننا بھی پسند نہیں کرے گی لہٰذا اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں ضرورت مند، مجبور اور سفید پوش رشتہ داروں اور غربا و مساکین پر بھی خرچ کریں تاکہ آخرت میں آپ کے بھرپور کام آئے۔

☆......☆

☆زمین پر ڈھٹائی سے نہ چلو۔

☆ سچ کا ساتھ دو، جھوٹ سے پرہیز کرو۔

☆ ہم جنس پرستی میں نہ پڑو۔

☆ دنیا سے اپنے حصے کا کام مکمل کرکے جاؤ۔

ٹائی ٹینک

محمد زید
(سال دوم)

تاریخی حقائق کے مطابق جب مشہور برطانوی بحری جہاز ٹائی ٹینک حادثے کا شکار ہوا تو اس کے آس پاس تین ایسے بحری جہاز موجود تھے جو ٹائی ٹینک کے مسافروں کو بچا سکتے تھے۔ سب سے قریب جو جہاز موجود تھا اس کا نام سیمسن (Samson) تھا اور وہ حادثے کے وقت ٹائی ٹینک سے صرف سات میل کی دوری پہ تھا۔ سیمسن کے عملے نے نہ صرف ٹائی ٹینک کے عملے کی طرف سے فائر کیے گئے سفید شعلے (جو کہ انتہائی خطرے کی صورت میں فضا میں فائر کیے جاتے ہیں) دیکھے تھے بلکہ مسافروں کی آہ و بکا کو سنا بھی تھا۔ لیکن کیونکہ سیمسن کے عملے کے لوگ غیر قانونی طور پہ انتہائی قیمتی سمندری حیات کا شکار کر رہے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ پکڑے جائیں لہٰذا ٹائی ٹینک کی صورتحال کا اندازہ ہوتے ہی بجائے مدد کرنے کے وہ جہاز کو ٹائی ٹینک کی مخالف سمت میں بہت دور لے گئے۔ یہ جہاز ہم میں سے ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی گناہوں بھری زندگی میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ ان کے اندر سے انسانیت کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور پھر وہ ساری زندگی اپنے گناہوں کو چھپاتے گزار دیتے ہیں۔

دوسرا جہاز جو قریب موجود تھا اس کا نام کیلیفورنین (Californian) تھا جو حادثے کے وقت ٹائی ٹینک سے چودہ میل دور تھا۔ اس جہاز کے کیپٹن نے بھی ٹائی ٹینک کی طرف سے مدد کی پکار کو سنا اور باہر نکل کے سفید شعلے اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن کیونکہ وہ اس وقت برف کی چٹانوں میں گھرا ہوا تھا اور اسے ان چٹانوں کے گرد چکر کاٹ کے ٹائی ٹینک تک پہنچنے میں خاصی مشکل صورتحال سے دو چار ہونا پڑتا لہٰذا کیپٹن نے اس کی بجائے دوبارہ اپنے بستر میں جانا اور صبح روشنی ہونے کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ صبح جب وہ ٹائی ٹینک کی لوکیشن پہ پہنچا تو ٹائی ٹینک کو سمندر کی تہہ میں پہنچے چار گھنٹے گزر چکے تھے اور ٹائی ٹینک کے کیپٹن ایڈورڈ اسمتھ سمیت 1569 افراد موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے۔ یہ جہاز ہم میں سے ان افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی کی مدد کرنے کو اپنی آسانی سے مشروط کر دیتے ہیں اور جب تک حالات حق میں نہ ہوں کسی کی مدد کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے۔

تیسرا جہاز کارپیتھیا (Carpathia) تھا جو ٹائی ٹینک سے 68 میل دور تھا۔ اس جہاز کے کیپٹن نے ریڈیو پر ٹائی ٹینک کے مسافروں کی چیخ و پکار سنی۔ صورتحال کا اندازہ ہوتے ہی باوجود اس کے کہ یہ ٹائی ٹینک کی مخالف سمت میں جنوب کی

طرف جا رہا تھا، اس نے فوراً اپنے جہاز کا رُخ موڑا اور اللہ کا نام لے کے برف کی چٹانوں اور خطرناک موسم کی پرواکیے بغیر مدد کے لیے روانہ ہو گیا۔ اگر چہ یہ دور ہونے کے باعث ٹائی ٹینک کے ڈوبنے کے دو گھنٹے بعد لوکیشن پہ پہنچ سکا لیکن یہی وہ جہاز تھا جس نے لائف بوٹس پر امداد کے منتظر ٹائی ٹینک کے باقی ماندہ 710 مسافروں کو زندہ بچایا تھا اور انہیں بحفاظت نیو یارک پہنچا دیا تھا۔

اس جہاز کے کیپٹن آرتھر روسٹرن کو برطانوی نیوی کی تاریخ کے چند بہادر ترین کیپٹنز میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کے اس عمل پہ انہیں کئی سماجی اور حکومتی ایوارڈز سے بھی نوازا گیا تھا۔

یاد رکھیے، ہماری زندگی میں ہمیشہ مشکلات رہتی ہیں، چیلنجز رہتے ہیں، لیکن وہ جوان مشکلات اور چیلنجز کا سامنا کرتے ہوئے بھی انسانیت کی بھلائی کے لیے کچھ کر جائیں انہیں ہی انسان اور انسانیت یاد رکھتی ہے۔

دعا کیا کریں کہ خدا کسی کی مدد کی توفیق دے کیوں کہ یہ انسانیت کی معراج اور اعلیٰ ترین درجہ ہے۔
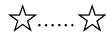
دینِ فطرت

مٹی کے برتنوں سے سٹیل اور پلاسٹک کے برتنوں تک اور پھر کینسر کے خوف سے دوبارہ مٹی کے برتنوں تک آ جانا، انگوٹھا چھاپ سے پڑھ لکھ کر دستخطوں (Signature) پر اور پھر آ کر کار انگوٹھا چھاپ (Thumb Scaning) پر آ جانا، پھٹے ہوئے سادہ کپڑوں سے صاف ستھرے اور استری شدہ کپڑوں پر اور پھر فیشن کے نام پر اپنی جینز پھاڑ لینا، زیادہ مشقت والی زندگی سے گھبرا کر پڑھنا لکھنا اور پھر پی ایچ ڈی کر کے واکنگ ٹریک (Walking Track) پر پسینے بہانا، قدرتی غذاؤں سے پراسس شدہ کھانوں (Canned Food) پر اور پھر بیماریوں سے بچنے کے لیے دوبارہ قدرتی کھانوں (Organic Foods) پر آ جانا، اس کی تشریح کریں تو یہ بنے گی کہ ٹیکنالوجی نے صرف یہ ثابت کیا ہے کہ مغرب نے تمھیں جو دیا اس سے بہتر وہ تھا جو تمھارے دین نے اور تمھارے رب نے تمھیں پہلے سے دے رکھا تھا۔

سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔۔۔۔۔۔۔۔
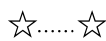
انسان کی سب سے بڑی کمزوری

انتخاب : کرن شہزادی

(ایم۔اے اسلامیات سال اوّل)

بادشاہ کا موڈ اچھا تھا!!!

وہ نوجوان وزیر کی طرف مڑا اور مسکرا کر پوچھا۔

''تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے۔''

وزیر شرما گیا، اس نے منہ نیچے کر لیا، بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''تم گھبراؤ مت، بس اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بتاؤ۔''

وزیر گھٹنوں پر جھکا اور عاجزی سے بولا۔

''حضور آپ دنیا کی خوبصورت ترین سلطنت کے مالک ہیں، میں بھی یہ سلطنت دیکھتا ہوں تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے اگر اس کا دسواں حصہ میرا ہوتا تو میں دنیا کا خوش نصیب ترین شخص ہوتا۔''

وزیر خاموش ہو گیا،

بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''میں اگر تمہیں اپنی آدھی سلطنت دے دوں تو؟''

وزیر نے گھبرا کر اوپر دیکھا اور عاجزی سے بولا۔

''بادشاہ سلامت یہ کیسے ممکن ہے، میں اتنا خوش قسمت کیسے ہو سکتا ہوں۔''

بادشاہ نے فوراً احکامات لکھنے کا حکم دیا، بادشاہ نے پہلے حکم کے ذریعے اپنی آدھی سلطنت نوجوان وزیر کے حوالے کرنے کا فرمان جاری کر دیا،

دوسرے حکم میں بادشاہ نے وزیر کا سر قلم کرنے کا آرڈر دے دیا،

وزیر دونوں احکامات پر حیران رہ گیا، بادشاہ نے احکامات پر مہر لگائی اور وزیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''تمہارے پاس تیس دن ہیں، تم نے ان 30 دِنوں میں صرف تین سوالوں کے جواب تلاش کرنا ہیں، تم کامیاب ہو گئے تو میرا دوسرا حکم منسوخ ہو جائے گا اور تمہیں آدھی سلطنت مل جائے گی اور اگر تم ناکام ہو گئے تو پہلا حکم خارج سمجھا جائے گا

اور دوسرے حکم کے مطابق تمہارا سر اُتار دیا جائے گا۔''

وزیر کی حیرت پریشانی میں بدل گئی، بادشاہ نے اس کے بعد فرمایا۔

''میرے تین سوال لکھ لو''

وزیر نے لکھنا شروع کر دیا، بادشاہ نے کہا۔

''انسان کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی کیا ہے؟''

وہ رُکا اور بولا۔

''دوسرا سوال، انسان کی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کیا ہے''

وہ رُکا اور پھر بولا۔

''تیسرا سوال، انسان کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے۔''

بادشاہ نے اس کے بعد نقارے پر چوٹ لگوائی اور بآواز بلند فرمایا۔

''تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب''۔

وزیر نے دونوں پروانے اُٹھائے اور دربار سے دوڑ لگا دی، اس نے اس شام ملک بھر کے دانشور، ادیب، مفکر اور ذہین لوگ جمع کیے اور سوال ان کے سامنے رکھ دیئے، ملک بھر کے دانشور ساری رات بحث کرتے رہے لیکن وزیر نے دوسرے دن دانشور بڑھا دیئے لیکن نتیجہ وہی نکلا، وہ آنے والے دِنوں میں لوگ بڑھاتا رہا مگر اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا یہاں تک کہ وہ مایوس ہو کر دارالحکومت سے باہر نکل گیا۔

وہ سوال اُٹھا کر پورے ملک میں پھرا مگر اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا، وہ مارا مارا پھرتا رہا، شہر شہر، گاؤں گاؤں کی خاک چھانتا رہا، شاہی لباس پھٹ گیا، پگڑی ڈھیلی ہو کر گردن میں لٹک گئی، جوتے پھٹ گئے اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔

یہاں تک کہ شرط کا آخری دن آ گیا، اگلے دن اس نے دربار میں پیش ہونا تھا۔

وزیر کو یقین تھا یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہے، کل اس کی گردن کاٹ دی جائے گی اور جسم شہر کے مرکزی پل پر لٹکا دیا جائے گا۔

وہ مایوسی کے عالم میں دارالحکومت کی کچی آبادی میں پہنچ گیا، آبادی کے سرے پر ایک فقیر کی جھونپڑی تھی، وہ گرتا پڑتا اس کٹیا تک پہنچ گیا، فقیر سوکھی روٹی پانی میں ڈبو کر کھا رہا تھا، ساتھ ہی دودھ کا پیالہ پڑا تھا اور فقیر کا کتا شڑاپ شڑاپ کی آوازوں کے ساتھ دودھ پی رہا تھا۔

فقیر نے وزیر کی حالت دیکھی، قہقہہ لگایا اور بولا ''جناب عالی! آپ صحیح جگہ پہنچے ہیں، آپ کے تینوں سوالوں کے

جواب میرے پاس ہیں۔''

وزیر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا، میں کون ہوں اور میرا مسئلہ کیا ہے''۔

فقیر نے سوکھی روٹی کے ٹکڑے چھابے میں رکھے، مسکرایا، اپنا بوریا اُٹھایا اور وزیر سے کہا۔

''یہ دیکھئے آپ کو بات سمجھ آ جائے گی۔''

وزیر نے جھک کر دیکھا، بوریئے کے نیچے شاہی خلعت بچھی تھی، یہ وہ لباس تھا جو بادشاہ اپنے قریب ترین وزراء کو عنایت کرتا تھا، فقیر نے کہا۔

''جناب عالیٰ میں بھی اس سلطنت کا وزیر ہوتا تھا، میں نے بھی ایک بار آپ کی طرح بادشاہ سے شرط لگانے کی غلطی کر لی تھی، نتیجہ آپ خود دیکھ لیجیے''۔

فقیر نے اس کے بعد سوکھی روٹی کا ٹکڑا اُٹھایا اور دوبارہ پانی میں ڈبو کر کھانے لگا، وزیر نے دکھی دل سے پوچھا۔

''کیا آپ بھی جواب تلاش نہیں کر سکے تھے۔''

فقیر نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔

''میرا کیس آپ سے مختلف تھا، میں نے جواب ڈھونڈ لیے تھے، میں نے بادشاہ کو جواب بتائے آدھی سلطنت کا پروانہ پھاڑا، بادشاہ کو سلام کیا اور اس کٹیا میں آ کر بیٹھ گیا، میں اور میرا کتا دونوں مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔''

وزیر کی حیرت بڑھ گئی لیکن یہ سابق وزیر کی حماقت کے تجزیے کا وقت نہیں تھا۔

جواب معلوم کرنے کی گھڑی تھی چنانچہ وزیر اینکر پرسن بننے کی بجائے فریادی بن گیا اور اس نے فقیر سے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے سوالوں کے جواب دے سکتے ہیں۔''

فقیر نے ہاں میں گردن ہلا کر جواب دیا۔

''میں پہلے دو سوالوں کا جواب مفت دوں گا لیکن تیسرے جواب کے لیے تمہیں قیمت ادا کرنا ہوگی۔''

وزیر کے پاس شرط ماننے کے سوا کوئی آپشن نہیں تھا، اس نے فوراً ہاں میں گردن ہلا دی، فقیر نے بولا۔

''دنیا کی سب سے بڑی سچائی موت ہے، انسان کوئی بھی ہو، کچھ بھی ہو، وہ اس سچائی سے نہیں بچ سکتا۔''

وہ رُکا اور بولا۔

''انسان کی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا زندگی ہے، ہم میں سے ہر شخص زندگی کو دائمی سمجھ کر اس کے دھوکے میں آ جاتا ہے۔''

فقیر کے دونوں جواب ناقابل تردید تھے، وزیر سرشار ہو گیا، اس نے اب تیسرے جواب کے لیے فقیر سے شرط پوچھی،

فقیر نے قہقہہ لگایا، کتے کے سامنے سے دودھ کا پیالہ اُٹھایا، وزیر کے ہاتھ میں دیا اور کہا۔

''میں آپ کو تیسرے سوال کا جواب اس وقت تک نہیں دوں گا جب تک آپ یہ دودھ نہیں پیتے''۔

وزیر کے ماتھے پر پسینہ آ گیا، اس نے نفرت سے پیالہ زمین پر رکھ دیا، وہ کسی قیمت پر کتے کا جوٹھا دودھ نہیں پینا چاہتا تھا، فقیر نے کندھے اُچکائے اور کہا۔

''تمہارے پاس اب دو راستے ہیں، تم انکار کر دو اور شاہی جلاد کل تمہارا سر اُتار دے یا پھر تم یہ آدھ پاؤ دودھ پی جاؤ اور تمہاری جان بھی بچ جائے اور تم آدھی سلطنت کے مالک بھی بن جاؤ، فیصلہ بہر حال تم نے کرنا ہے۔''

وزیر مخمصے میں پھنس گیا، ایک طرف زندگی اور آدھی سلطنت تھی اور دوسری طرف کتے کا جوٹھا دودھ تھا، وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا یہاں تک کہ جان اور مال جیت گیا اور سلیف ریسپیکٹ ہار گئی، وزیر نے پیالہ اُٹھایا اور ایک ہی سانس میں دودھ پی گیا،

فقیر نے قہقہہ لگایا اور بولا ''میرے بچے''

انسان کی سب سے بڑی کمزوری غرض ہوتی ہے۔

یہ اسے کتے کا جوٹھا دودھ تک پینے پر مجبور کر دیتی ہے اور یہ وہ سچ ہے جس نے مجھے سلطنت کا پروانہ پھاڑ کر اس کٹیا میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا، میں جان گیا تھا، میں جوں جوں زندگی کے دھوکے میں آؤں گا، میں موت کی سچائی کو فراموش کرتا جاؤں گا اور میں موت کا جتنا فراموش کرتا رہوں گا، میں اتنا ہی غرض کی دلدل میں دھنستا جاؤں گا اور مجھے روز اس دلدل میں سانس لینے کے لیے غرض کا غلیظ دودھ پینا پڑے گا لہٰذا میرا مشورہ ہے، زندگی کی ان تینوں حقیقتوں کو جان لو، تمہاری زندگی اچھی گزرے گی''

وزیر خجالت، شرمندگی اور خود ترسی کا تحفہ لے کر فقیر کی کٹیا سے نکلا اور محل کی طرف چل پڑا، وہ جوں جوں محل کے قریب پہنچ رہا تھا اس کے احساس شرمندگی میں اضافہ ہو رہا تھا، اس کے اندر ذلت کا احساس بڑھ رہا تھا، وہ اس احساس کے ساتھ محل کے دروزے پر پہنچا۔

اس کے سینے میں خوفناک ٹیس اُٹھی، وہ گھوڑے سے گرا، لمبی ہچکی لی اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ہمیں کسی دن کسی ٹھنڈی جگہ پر بیٹھ کر زندگی کے ان بنیادی سوالوں پر ضرور غور کرنا چاہیے، ہمیں یہ سوچنا چاہیے، ہم لوگ کہیں زندگی کے دھوکے میں آ کر غرض کے پیچھے تو نہیں بھاگ رہے، ہم لوگ کہیں موت کو فراموش تو نہیں کر بیٹھے۔

ہم کہیں اس کہانی کے وزیر تو نہیں بن گئے، مجھے یقین ہے، ہم لوگوں نے جس دن یہ سوچ لیا اس دن ہم غرض کے ان غلیظ پیالوں سے بالاتر ہو جائیں گے۔

شیخ سعدیؒ کے اقوال

حافظ محمد اویس (سال دوم)

شیخ سعدیؒ کا اصل نام شرف الدین تھا۔ انہیں ''حکیمِ مشرق'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ''معلمِ اخلاق'' بھی کہلاتے ہیں۔ سلطان سعد زنگی کے زمانے میں ایران کے شہر شیراز میں پیدا ہوئے۔ شیخ سعدیؒ نے طویل عمر پائی اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزارا۔

شیخ سعدیؒ نے شاعری بھی کی اور نثر میں بھی لکھا۔ شاعری میں ان کی مثنوی ''بوستان'' اور نثری کتابوں میں ''گلستان'' کو بہت زیادہ شہرت اور اہمیت ملی۔ خاص طور پر ''گلستان'' اپنی فکری تازگی اور دانش و حکمت کی بنا پر ادبِ عالیہ میں شمار کی جاتی ہے۔ دنیا میں پائی جانے والی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ حکمت و دانش سے بھرپور ان کے کچھ اقوال درج ہیں۔

۱۔ دنیا کا مال زندگی کے آرام اور سکون کے لیے ہے، نہ کہ زندگی مال جمع کرنے کے لیے۔

۲۔ اگر تو دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو لوگوں پر احسان کر جیسے اللہ نے تجھ پر احسان فرمایا۔

۳۔ دو آدمیوں کی کوشش بے فائدہ ہے، ایک وہ جس نے مال کمایا مگر کھایا نہیں، دوسرا وہ جس نے علم پڑھا مگر اس پر عمل نہ کیا۔

۴۔ بے عمل عالم ایسا ہے جیسے اندھے کے ہاتھ میں مشعل، لوگ تو اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، مگر وہ خود کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

۵۔ دشمن کے ساتھ بے موقع نرمی کرنا اسے شیر بنانا ہے۔

۶۔ وہ دشمن جو بظاہر دوست ہو، اس کے دانتوں کا زخم زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

۷۔ دیوار کے پیچھے بھی بات کرتے وقت ہوشیار رہ، ہوسکتا ہے کہ دوسری طرف دشمن کان لگا کر سن رہا ہو۔

۸۔ اگرچہ معاف کرنا اچھا ہے لیکن لوگوں کو ستانے والے کے زخم پر مرہم نہ رکھ۔

۹۔ بُری عادت والا انسان اپنی بُری عادت کی وجہ سے ہمیشہ مصیبت میں پھنسا رہتا ہے۔

۱۰۔ بات اس وقت کر جب تجھے یقین ہوا کہ اثر ہوگا۔ بے فائدہ بات کر کے اپنی قدر نہ گھٹا۔

۱۱۔ دس آدمی ایک دسترخوان پر اکٹھے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں مگر دو کُتے ایک مُردار کو مل کر نہیں کھا سکتے۔

۱۲۔ سب سے بڑا بدنصیب وہ ہے جو لوگوں کو ستاتا ہے، کیونکہ جب اس پر مصیبت پڑے گی تو کوئی اس کا دوست نہ ہوگا۔

۱۳۔ جو بُری صحبت میں بیٹھتا ہے، اس کی سوچ کبھی اچھی نہ ہوگی۔

۱۴۔ حاسد کے لیے بددعا کرنے کی ضرورت نہیں، وہ تو پہلے ہی حسد کی آگ میں جل رہا ہے۔

۱۵۔ کتا دنیا کی ذلیل ہستی شمار ہوتا ہے، مگر حق شناس کتا ناشکرے انسان سے بہتر ہے۔

سگریٹ کی کہانی

محمد روشان خاں (سال دوم)

کیا آپ جانتے ہیں کہ سگریٹ کس نے ایجاد کی؟ کیا آپ کے ذہن میں بھی یہ سوال ہے کہ تمباکو نوشی کی وجہ سے ہونے والی اموات کے لیے کیا اس شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

موجود شکل کا سگریٹ پہلی دفعہ ''جیمز بکانن ڈیوک'' نے بنایا تھا۔ جیمز بکانن ڈیوک نہ صرف سگریٹ کو اس کی موجودہ شکل دینے کے ذمہ دار ہیں بلکہ انہوں نے سگریٹ کی مارکیٹنگ اور ترسیل میں بھی اہم کردار ادا کیا جس سے ساری دنیا میں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ سنہ 1880ء میں چوبیس سال کی عمر میں ڈیوک نے ہاتھ سے بنی سگریٹ کے کاروبار میں قدم رکھا جو اس وقت بہت وسیع کاروبار نہیں تھا۔ شمالی کیرولائنا کے شہر ڈرہم میں کچھ لوگوں نے مل کر ''ڈیوک آف ڈرہم'' کے نام سے سگریٹ بنانے کی شروعات کی جس کے دونوں کونوں کو موڑ کر بند کیا جاتا تھا۔

دو سال بعد ڈیوک نے جیمز بونسیک نامی نوجوان مکینک کے ساتھ کام کرنا شروع کیا جس کا کہنا تھا کہ وہ مشین سے سگریٹ بنا سکتا ہے۔ ڈیوک کو بونسیک کی اس بات میں کاروبار کا ایک اچھا موقع دکھائی دیا۔ انہیں یقین تھا کہ ہاتھ سے بنی چھوٹے یا بڑے سائز کی سگریٹ کی جگہ لوگ مشین سے بنی، ایک ہی شکل کی سگریٹ پینا پسند کریں گے۔

ساتھ ہی اس وقت ڈیوک کارخانے میں جہاں لڑکیاں ایک شفٹ میں ہاتھ سے تقریباً دو سو سگریٹ بناتی تھیں، وہیں اس نئی مشین سے ایک دن میں ایک لاکھ بیس ہزار سگریٹ تیار ہونے لگے جبکہ اس وقت امریکہ میں صرف چوبیس ہزار سگریٹ کی ہی کھپت ہوتی تھی۔ اُردن گڈ مین کہتے ہیں، ''مسئلہ یہ تھا کہ سگریٹ کی پیداوار زیادہ تھی لیکن فروخت کم۔ اس لیے ڈیوک کو اب سگریٹ فروخت کرنے کے نئے طریقے تلاش کرنے تھے۔

وہ طریقہ تھا اشتہارات اور مارکیٹنگ۔ جیمز ڈیوک نے گھڑ دوڑ کو سپانسر کرنا، مقابلہ حسن میں مفت سگریٹ تقسیم کرنا اور جرائد میں اشتہار دینا شروع کیا۔ سنہ 1889ء میں ہی سگریٹ کی مارکیٹنگ پر انہوں نے آٹھ لاکھ ڈالر خرچ کیے جو آج تقریباً دو کروڑ پچاس لاکھ ڈالر کے برابر ہے۔ صفائی سے بنی سگریٹ اور ان کے صحیح تشہیر، جیمز ڈیوک کی ابتدائی کامیابی کی یہی دو وجوہات تھیں۔ ایک اشتہار میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہاتھ سے اور تھوک کے استعمال سے بنائی جانے والی سگار کے مقابلے میں مشین سے بنائی سگریٹ زیادہ صفائی سے بنائی جاتی ہے اور جیمز ڈیوک کی اُمید کے عین مطابق لوگوں کو مشین سے بنی سگریٹ ہی زیادہ پسند آئی۔

امریکہ میں پاؤں جمانے کے بعد جیمز ڈیوک نے برطانیہ کا رُخ کیا۔ سنہ 1902ء میں انہوں نے برطانیہ کی امپیریل ٹوبیکو کمپنی کے ساتھ مل کر برٹش امریکن ٹوبیکو نامی کمپنی قائم کی۔

کمپنی کی طرف سے فروخت کی جانے والی سگریٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی، صرف مختلف صارفین کے حساب سے انکی پیکیجنگ اور مارکیٹنگ حکمت عملی بدلی جاتی تھی۔ مصنف اُردن گڈ مین کہتے ہیں،''میکڈانلڈ زاور سٹاربکس کے طور پر ہم آج جسے گلوبلائزیشن کہتے ہیں، اس کے بانی ڈیوک اور ان کی سگریٹ تھے۔

دنیا بھر میں آج سگریٹ نوشی بڑھ رہی ہے اور ترقی پذیر ممالک میں سگریٹ کی طلب میں ہر سال تین اعشاریہ چار فیصد کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔

عالمی ادارۂ صحت نے خبردار کیا ہے کہ اگر سگریٹ نوشی کو روکنے کے لیے ضروری اقدامات نہیں کیے گئے تو اگلے تیس سال میں دس کروڑ افراد تمباکو سے متعلقہ بیماریوں کی وجہ سے موت کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ تعداد ایڈز، ٹی بی، کار حادثوں اور خودکشی سے ہونے والی کل اموات سے زیادہ ہے۔

لیکن کیا اس سب کے لیے جیمز بکانن ڈیوک کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

شائد یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوا کہ 1930 تک سگریٹ بطور دوا استعمال ہوتا تھا۔ پھیپھڑے کے کینسر اور سگریٹ پینے کے درمیان تعلق کا پتہ 1930ء کی دہائی تک نہیں چلا تھا جبکہ جیمز ڈیوک کی موت 1925ء میں ہوئی۔ یہاں تک کہ اس وقت سگریٹ کو صحت کے لیے فائدہ مند بتا کر تشہیر کی گئی۔ سنہ 1906ء تک سگریٹ، ادویات کے انسائیکلوپیڈیا میں شامل تھی۔

''ٹوبیکو کنٹرول'' میگزین کے ایک حالیہ مضمون میں رابرٹ پروکٹر لکھتے ہیں کہ تمباکو کی صنعت کے کئی لوگ اس کے ذمہ دار ہیں جن میں انہیں فروخت کرنے والی دکانیں، اشتہاری کمپنیاں، سگریٹ پیکٹ ڈیزائن کرنے والے، اداکار اور سگریٹ کمپنیوں میں کام کرنے والے لوگ سب شامل ہیں۔ اُردن گڈ مین مانتے ہیں کہ جیمز ڈیوک ہیرو بھی ہیں اور ولن بھی۔ وہ کہتے ہیں،''بازار، انسانی نفسیات اور اشتہارات کی دنیا کی سمجھ کے لحاظ سے وہ ہیرو ہیں لیکن سگریٹ اور تمباکو نوشی سے متعلق تنازعات سے یہ سب چھپ جاتا ہے۔ گڈ مین کہتے ہیں،''جیمز ڈیوک نے دنیا کو سگریٹ دی اور یہی سگریٹ بیسویں صدی کا مسئلہ ہے۔''

سگریٹ اس وقت دنیا بھر میں شاید سب سے زیادہ بدنام مصنوعات میں سے ایک ہے۔ سنہ 2000ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں پھیپھڑوں کے کینسر سے ہر سال تقریباً دس لاکھ افراد ہلاک ہو رہے تھے اور ان میں سے تقریباً پچاسی فیصد لوگوں میں اس کینسر کی وجہ صرف تمباکو نوشی تھی۔

امریکہ کی سٹینفورڈ یونیورسٹی سے وابستہ ''رابرٹ پرکٹر'' کہتے ہیں۔''انسانی تہذیب کی تاریخ میں سگریٹ سب سے خطرناک مصنوعات ہے۔ بیسویں صدی میں تمباکو نوشی کی وجہ سے تقریباً دس کروڑ لوگ مر چکے ہیں۔''

''ٹوبیکو ان ہسٹری'' نامی کتاب کے مصنف اُردن گڈ مین کے خیال میں اگرچہ وہ ایسے کسی شخص خاص کا نام لینے سے اجتناب کریں گی لیکن ''امریکہ کے جیمز بکانن ڈیوک سگریٹ کے ایجاد کے ذمہ دار تھے۔''

☆......☆

مسکوکات کی تاریخ اورضرورت واہمیت

فیاض ملک (پی۔ایچ۔ڈی سکالر)

انسان جنت سے گندم کا دانہ کھانے کی وجہ سے نکلا۔زمین پر آیا تب بھی کھانا اس کی ضرورت رہا۔اگر انسان کو من و سلویٰ بھی دیا جائے تب بھی انسان بعض اوقات ایسے کھانے کھانا چاہتا ہے جو من وسلویٰ سے ہٹ کر ہوں کیونکہ انسان یکسانیت سے اُکتا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم نے ساگ پات، ککڑی، گیہوں اور لہسن وغیرہ کھانے کا مطالبہ کیا اور یہ ایسی چیزیں تھیں جو ایک انسان ایک وقت میں سب کی سب پیدا نہیں کرسکتا تھا اس لیے ایک دوسرے سے لین دین کا رواج پیدا ہوا۔

بارٹرسسٹم

جب پیسا ایجاد نہیں ہوا تھا اس وقت بارٹرسسٹم تھا، چیزوں کے بدلے میں چیزیں۔ چاول دے کر گندم، گندم دے کر مکئی، مکئی دے کر جو اور جو دے کر تل حاصل کر لیے جاتے تھے۔لوگ خدمات اور مصنوعات کے بدلے میں خدمات اور مصنوعات ہی تبدیل کرتے تھے۔ایک پارٹی کچھ خریدتی تھی جس کے تبادلے کے طور پر مارکیٹ میں پڑی کوئی بھی چیز لی جاتی تھی،اس کو بارٹرسسٹم کہتے ہیں۔

تقریباً 6000 قبل مسیح میسوپوٹامیا قبائل کی طرف سے بارٹرسسٹم متعارف کروایا گیا۔مختلف ملکوں اور شہروں میں بھی اس کو Phoenicians کی طرف سے منظور کرلیا گیا Phoenicians نے یہ نظام تبدیل کیا اور سامان، چائے، کھانے وغیرہ کا تبادلہ ہتھیاروں اور مصالحے کے ساتھ کرنے لگے اور بعض اوقات تو انسانی کھوپڑی کے ساتھ بھی چیزوں کے تبادلے کیے جاتے تھے۔نمک ایک قیمتی اور مقبول چیز تھی لہٰذا رومن فوجیوں کی تنخواہوں کی مد میں نمک دیا جاتا رہا ہے۔قرون وسطیٰ میں چیزوں کے تبادلے کے لیے دنیا بھر کا سفر کیا گیا۔جانوروں کی اُون اور خوشبو کے بدلے میں دستکاری اور ریشم کا تبادلہ ہوتا تھا۔ امریکہ میں بندوق کا تبادلہ گینڈوں اور ہرن کی کھال کی تبادلہ گندم سے کیا جاتا تھا۔

سکوں کی ضرورت اور اہمیت

بارٹر ہمیشہ کام نہیں کرے گا اور تبادلے کے لیے چھوٹے یا درمیانے درجے کی قیمتی چیز کی ضرورت تھی۔مکسوکات یعنی سکوں کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب اشیاء عیب دار ہوتی تھیں اور لوگ اُن اشیاء کے بدلے اچھی اشیاء کا تبادلہ کرنے پر

مجبور ہوتے تھے مثلاً بندوق کے بدلے میں گینڈا اور ہرن کی کھال کے بدلے میں گندم کا تبادلہ۔ اُس وقت لوگوں نے خیال کیا کہ اشیاء کی قیمت متعین کی جائے لیکن بارٹر سسٹم میں اشیاء کی قیمت متعین نہیں ہوسکتی تھی لہٰذا سکے معرضِ وجود میں لائے گئے۔ بعض سکے چمڑے کے، بعض تانبے، چاندی، سونے، سلور اور بعض مختلف دھاتوں پر مبنی تھے۔

تاجر حضرات تبادلے کے لیے درمیانے درجے کے سکے ایجاد کرنا چاہتے تھے۔ سکے کی ابتدا Ephesus lydia اور Aegina جزیروں کے درمیان کہیں شروع ہوئی، اس کے ساتھ ہی ہر طرف سکوں کی پیداوار کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اس بات پر یقین کر لینا ممکن نہیں، کہیں کہیں یہ سننے پڑھنے میں آتا ہے کہ ایشیاء میں سب سے پہلے چین میں سکوں کی پیداوار شروع ہوئی لیکن چین میں اسے سکے کی بجائے ''ٹنکن'' کہا جاتا تھا۔ یہ تانبے سے ایک مخصوص سائز اور قیمت مقرر کر کے بنائے گئے اور تجارت کے لیے استعمال کیے گئے۔ تمام تہذیبوں میں سکے (ٹنکن) کی پیداوار نے Trading کو آسان بنا دیا ہے۔

وقت گزرتا گیا اور مسکوکات کی ضرورت و اہمیت بڑھتی چلی گئی۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر بعض اوقات کسی بڑے پتھر کو کاٹ کر سکے کی شکل میں ڈھال دیا جاتا اور اس میں سوراخ کر کے لکڑی کے چھوٹے سانچے میں فٹ کر دیا جاتا تھا لیکن یہ سکے اتنے بھاری ہوتے تھے جو جیب میں سوراخ کر دیتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان مسکوکات نے مہروں کا کام بھی دینا شروع کر دیا کیونکہ سکوں کی دونوں اطراف مختلف تصاویر ہوتی تھیں۔ بعض سکوں پر کسی شخصیت جبکہ بعض پر کسی تاریخی عمارت، مسجد، مندر، کلیسا یا کسی انتہائی اہم عمارت کی تصویر کندہ ہوتی۔ ماضی قریب میں ایک مثال سامنے آئی ہے۔ جس میں Croony Ross خاندان Seychelles Islands کے رہائشی ہیں، قیمت کو دکھانے کے لیے مستقل سیاہی کے ساتھ مہر لگاتے ہیں جو مربع کٹ ہاتھی دانت پر مشتمل ہے۔

آج ساری دنیا اس بات کو ماننے پر مجبور ہے کہ یونانی کاریگروں کے ہاتھ سے بننے والے سکے زیادہ خوبصورت ہیں جو خوش قسمتی سے 650 سال پہلے بنے اور آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور دیکھے جا سکتے ہیں۔ رومن Barter System کے تحت تنخواہوں کی جگہ نمک لیا کرتے تھے، نے ان کے سکوں کے خلاف پراپیگنڈہ کیا کہ ان کا معیار اور ان کی تصاویر و آرٹ بہتر نہیں، تاہم بازنطینی سلطنت کے آغاز سے رومی سلطنت کے اختتام تک جو سکے سامنے آئے ان میں بہترین سکے وہ تھے جو بہت سادہ تھے کیونکہ ان کے بنانے پر زیادہ محنت اور خرچہ نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مذہبی اثر و رسوخ حد سے زیادہ نہیں تھے۔ اس لیے سکے پر جس طرح کی تصویر چاہی اس طرح کی بنالی جاتی تھی۔ اس میں کسی شخصیت، جانور، عمارت یا عبادت گاہ کی قید نہیں تھی۔

مسکوکات کی پیداوار میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی دھاتیں سونا، چاندی اور تانبا یا جس میں کٹھور پن (سختی) پائی جاتی تھی، استعمال کی جاتی تھیں۔ یہی دھاتیں اس سکے کی قدر و قیمت کو واضح کرتی تھیں۔

پہلے یہودی انقلاب سے قبل Tyrain Shekel ہی وہ واحد سکہ تھا جس پر سؤر کی تصویر تھی اور منادر (مندروں) کے ٹیکس کی ادائیگی کے لیے مناسب سمجھا جاتا تھا۔ رومیوں کے اسرائیل پر قبضے کے بعد 126 قبل مسیح میں رومن آتے ہوئے اپنے ساتھ سکے بھی لے کر آئے جو غیر معیاری تھے۔ کئی میں 80% چاندی اور کئی سکوں میں 95% استعمال کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ سکوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مندروں کا ٹیکس دیا جانے لگا۔ بعد ازاں یہودی مذہبی رہنماؤں کی درخواست پر Tyrain Shekel Minting کو مندر کا ٹیکس ادا کرنے کے لیے جاری کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہودیوں کو ان کے روزمرہ کاروبار کے سلسلے میں رومن سکوں کے استعمال کی اجازت دے دی گئی اور شیکل کو مندروں کا ٹیکس دینے کے لیے مخصوص کر دیا گیا اس طرح Tyrain Shekel مذہبی رسومات اور مذہبی رہنماؤں تک محدود ہو گیا۔

66 عیسوی میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد یہودی رہنماؤں نے روم سے آزادی حاصل کرنے کی خوشی میں Minting کو دوبارہ شروع کر دیا۔ Minting کی پیداوار کے معاملے میں یہودی مختلف دھڑوں میں بٹ گئے کیونکہ ان میں سے کچھ کے مفادات رومن سکوں سے وابستہ تھے اور وہ Minting کے دوبارہ استعمال کے خلاف تھے۔ اس لیے یہ یقین سے نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی دوبارہ پیداوار کا ذمہ دار کون تھا۔

66 عیسوی کے بعد حکومتی مندروں میں محفوظ، چاندی سے سکے بنائے گئے جنہوں نے Tyrain Shekel کی جگہ لے لی۔ یہ وہ موقع تھا جب شیکل کو ہاف شیکل اور کواٹر شیکل میں تبدیل کیا گیا اور سکوں پر سن لکھنے کا رواج ڈالا گیا۔ مزید برآں نئے شیکل شلا لیہ جو ہاف اور کواٹر میں ٹکڑے ہوئے تھے، پر تصاویر کندہ کی گئیں۔ کچھ سکوں پر سؤر، کچھ پر شہر پناہ اور کچھ پر مقدس یروشلم کی تصاویر کندہ کی گئیں۔ 69 سے 71 عیسوی تک سکوں کی افراط اتنی ہو چکی تھی کہ جنگوں میں دشمن کو پسپا کرنے کے لیے غلیل میں ڈال کر سکے مارے جاتے تھے اور اس طرح سکوں نے ہتھیار کا کام بھی دینا شروع کر دیا کیونکہ سکوں کی پیداوار، پیتل میں بھی شروع ہو چکی تھی اور پیتل کے سکے سونے اور چاندی کی نسبت سخت اور کٹھور پن میں نمایاں ہوتے ہیں۔ تاہم پانچویں سال میں یہودی جنگ کے آخری چار ماہ کی پیداوار، چاندی کے ساتھ کانسی کے سکے بھی تھے۔

اگر ہم دنیا کو چھوڑ کر صرف پاکستان کے متعلق بات کریں تو یقینی طور پر یہ بات سامنے آئے گی کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے سکے معرض وجود میں آ چکے تھے اور مروج تھے لہٰذا پاکستان میں بھی سکے استعمال ہوتے رہے اور زمانہ حال تک استعمال ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں استعمال ہونے والے سکوں میں پیتل اور سلور کے سکے زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان مسکوکات میں زیادہ تر سکے گول ہیں اور کچھ چکور۔ جو چکور ہیں ان کے بھی کونے تیکھے نہیں ہیں۔ 1949ء میں استعمال ہونے والے تمام سکے پیتل کے بنے ہوئے تھے۔ ان مسکوکات میں ایک آنہ اور دو آنہ کے سکے بھی تھے۔ ان سکوں پر ہندی بھی لکھی ہوئی تھی اور ہندی کا سلسلہ تقریباً 1960ء تک چلا کیونکہ 1959ء تک ملنے والے مسکوکات پر ہندی موجود ہے جبکہ 1962ء

میں ملنے والے سکوں پر ہندی نہیں ہے بلکہ صرف حکومت پاکستان ہی لکھا ہوا ہے۔

پاکستان کے مسکوکات پر چاند ستارہ یا چاند ستارے میں مینار پاکستان کندہ ہوتا تھا اور دوسری طرف اس سکے کی قیمت یا مالیت (جو بھی آپ کہنا چاہیں) لکھی ہوتی تھی لیکن مختلف ادوار میں ان مسکوکات میں تبدیلیاں بھی آئیں۔1977ء میں ملنے والے سکوں میں ایک سکے کی ایک طرف حکومت پاکستان اور ایک روپیہ لکھا ہوا ہے جبکہ دوسری طرف علامہ اقبال کی تصویر ہے جس کے نیچے ''صد سالہ تقریب پیدائش علامہ اقبال'' لکھا ہوا ہے، اسی سن 1977ء میں ایک اور نایاب سکہ جاری کیا گیا جس کی ایک طرف اسلامک سمٹ مینار کی تصویر کندہ ہے اور مینار کے دونوں طرف کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے اور مینار کے نیچے "Islamic Summit Minar" کے الفاظ درج ہیں جبکہ دوسری طرف درمیان میں ''اللہ اکبر'' اور اطراف اطراف گولائی میں ''**وعتصمو بحبل الله جميعاً ولا تفرقو** '' کے الفاظ کندہ ہیں۔حکومت پاکستان کی طرف سے جاری ہونے والا یہ سکہ اپنے ڈیزائن کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے اچھا سکہ حکومت پاکستان نے کبھی بھی نہیں بنایا ایک عرصے تک لوگ اس سکے کو اپنی حفاظت کی غرض سے بطور تعویز گلے میں ڈالتے رہے ہیں۔سن 1401 ہجری میں بنائے جانے والے ایک روپے کی ایک طرف چاند ستارہ جبکہ دوسری طرف ''الھجر ۃ'' کے الفاظ موجود ہیں۔

2000ء میں سامنے آنے والے ایک روپے کے سکے پر ایک طرف قائداعظمؒ کی تصویر ہے جبکہ دوسری طرف مسجد کی تصویر ہے اور دو روپے مالیت کے سکے کی ایک طرف مسجد اور دوسری طرف چاند ستارہ ہے۔2003ء کو مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کا سال قرار دیا گیا، لہٰذا اس سن میں سکے کے ایک طرف حسب معمول چاند ستارہ اور دوسری طرف ''۲۰۰۳ سال مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح'' کے الفاظ رقم ہیں۔2008ء میں دس روپے کے سکے کے ایک طرف چاند ستارہ جبکہ دوسری طرف بینظیر بھٹو کی تصویر کندہ ہے اور اس پر ''دختر مشرق محترمہ بینظیر بھٹو 1953-2007'' کے الفاظ ہیں۔

ان دِنوں پاکستان میں سکوں کی کرنسی کم ہوتی جا رہی ہے اور نوٹ پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔اگر پاکستانی حکومت چاہے تو سکوں کو دوبارہ سے رواج دے سکتی ہے اور اس میں حکومت پاکستان کو میٹیریل بھی نہیں خریدنا پڑے گا کیونکہ پاکستان میں پیتل اور سلور کافی حد تک معدنیات کا حصہ ہے۔المختصر سکوں پر بہت سے لوگ تحقیق کر رہے ہیں اور تحقیق کے لیے یہ ایک بہترین موضوع ہے۔

پردہ

پروفیسر محمد اسلم بیگ، اسلام آباد

گرمی کا موسم تھا۔۔ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔۔ایک بزرگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ٹرین کے انتظار میں تھے۔۔ایک انگریز ٹی ٹی نے دیکھا تو سوچا کہ چلو چل کر مولانا صاحب سے دل لگی کرتے ہیں۔۔اس کی میم اس کے ساتھ تھی۔ قریب آ کر مولانا سے ہیلو ہائے کرنے لگا۔۔باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ مولانا آپ لوگ عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہو۔ان کو گھروں میں بند رکھتے ہیں، پردہ کرواتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔دیکھو ہم اپنی عورتوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔انہیں آزاد رکھتے ہیں۔۔کوئی پابندی نہیں لگاتے۔۔مولانا یہ باتیں سنتے رہے۔۔اس دوران مولانا نے اپنے شاگرد سے کہا کہ بھئی لیموں نکالو، شکنجبین بناتے ہیں، بڑی گرمی ہے۔۔شاگرد نے لیموں نکالا، ٹھنڈا پانی لیا، لیموں کاٹا، پھر پانی میں نچوڑنے لگے۔۔مولانا انگریز کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے۔۔وہ بڑے غور سے لیموں کو نچڑتا دیکھ رہا تھا۔اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔۔مولانا نے فوراً بھانپ لیا۔ پوچھا لیموں تو ہمارا ہے تمہارے منہ میں پانی کیوں آ گیا؟ کہنے لگا کہ لیموں چیز ہی ایسی ہے۔۔۔

فرمایا ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ عورت چیز ہی ایسی ہے۔۔عورت تمہاری اور منھ میں میرے پانی آ جائے۔۔۔؟؟

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ عورت کو پردے میں رکھو۔

مولانا کا جواب سن کر انگریز کا ایک رنگ آئے ایک جائے۔۔۔

☆......☆

☆ اللہ نادانستگی میں کی جانے والی غلطیاں معاف کر دیتا ہے۔

☆ آپ سے جو لوگ مدد اور تحفظ مانگیں ان کی حفاظت کرو، ان کی مدد کرو۔

☆ نماز کے وقت اچھے کپڑے پہنو۔

☆ کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔

☆ چغلی نہ کھاؤ

☆ ہیرا پھیری نہ کرو۔

مزارِ قائد کے سامنے

انتخاب: رانا بشارت علی
(لیب سپروائزر)

کراچی جانے کا اتفاق ہوا، مزار قائد پر کھڑا ہوا، نگاہوں کے سامنے ایک شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے جس کا سراپا کچھ ایسے محسوس ہوتا ہے:

سر .... بلند نہ جھکنے والا

ضمیر .... نہ بکنے والا

آنکھوں کی چمک .... اندھیری شب میں چمکتے آنکھوں کا چراغ

دبدبہ .... قلب ونظر کو مسخر کرنے والا

عزم .... ہمالیہ کی طرح بلند

ہمت .... نا قابلِ تسخیر

جرأت .... قابلِ رشک

اخلاق .... چاند کی چاندنی کی طرح شفاف

کردار .... اپنوں اور غیروں کے لیے قابلِ تقلید

گفتار .... جرأت آموز فکر وفریب سے مبراء

سیاست .... برائے عبادت نہ کہ برائے تجارت

شرافت .... جس کی دشمن بھی قسم کھائیں

مکار ہندو کے لیے .... ایک زوردار طمانچہ

شاطر انگریز کے لیے .... ایک صاعقہ

دونوں کی سازشوں .... کا پردہ چاک کرنے والا مشتاق

امت مسلمہ کا درد .... سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخنوں تک

اسلام سے محبت .... شک وشبہ سے بالا

ڈوبتی کشتی کا .... کھیون ہارا

اقبال کی فکر کو .... عملی طور پر اُجاگر کرنے والا

پاکستان کے خواب کی تعبیر .... حسین رنگ بھرنے والا

جس کی سوچ .... مسحور کن

فکر .... اسلام کی محبت سے آشکار

ولولہ .... محبتوں کا آئینہ دار

باہمی گفتگو .... تیغِ آبدار

چال .... باوقار

غلامی کی تاریک رات میں .... جوہرِ آبدار

فیصلہ .... چٹانوں کی طرح باوقار

بے تاج .... تاجدار قوم کی محبت اور عقیدت کا مرکز مجسم

قائداعظم!

اپنے خیالات میں گم ہوں کہ یہ سوال سامنے آتا ہے کہ روح قائد! کیا وہ مائیں ختم ہوگئیں جو تجھ جیسے تاریخ ساز انسانوں کو جنم دیتی تھیں!

جواب کا انتظار میں بھی کر رہا ہوں آپ بھی کریں۔

☆......☆

☆ گفتگو کے دوران بدتمیزی نہ کیا کرو۔

☆ غصے کو قابو میں رکھو۔

☆ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرو۔

☆ تکبر نہ کرو۔

ایک کرکٹر کا محبوبہ کے نام خفیہ خط

محمد ولایت رضا (سابقہ طالب علم)

لارڈز کے گراؤنڈ جیسی پیاری!

سلام کرکٹ!

میں گھر میں ہوں اسٹیڈیم میں .... باؤلنگ کر رہا ہوں یا بیٹنگ تمہاری بیلز جیسی پتلی کمر .... وکٹ جیسے پتلے بازو .... گیند جیسا گول چہرہ .... بلے جیسا سیڈول بدن .... ہمیشہ ایمپائر کی طرح میری نظر میں رہتا ہے ....اور تمہاری باتیں مخالف ٹیم کی سکور کی طرح میرے ذہن مین گردش کرتی رہتی ہیں............میرا جی چاہتا ہے کہ صبح سے لے کر چائے کے وقفے تک تجھے دیکھتا رہوں میں نے کئی بار دل کا سکور بورڈ تمہارے سامنے رکھنے کی کوشش کی............مگر تمہاری نظروں کے سامنے خود کو کلین بولڈ ہوتے دیکھتا ہوں۔ میں نے تمہاری محبت کے ہاتھوں کیچ ہونے سے بچنے کی بہت کوشش کی ....لیکن کبھی کامیاب نہ ہوسکا............میری خواہش ہے کہ............تیرے میرے پیار کا ون ڈے میچ عمر بھر چلتا رہے............اور میں ہمیشہ تمہارے ہاتھوں بولڈ ہوتا رہوں۔

خدارا! .... مجھے اس اننگز کی شکست سے بچا لو............ میران جذبات محبت کا جواب .... جلدی دیں ....کہیں تیرے انتظار میں زندگی کا یہ اوور ختم ہی نہ ہو جائے............

والسلام

چوکے خان ولد چھکے خاں .... پچ نمبر 1۔ کرکٹ پورہ ضلع ....عشق۔ تحصیل پیار............ ڈاکخانہ محبت ....براستہ دوستی

☆......☆

☆لوگوں کے ساتھ آہستہ بولا کرو۔

☆دوسروں کا مذاق نہ اڑایا کرو۔

☆منہ سے والدین کی توہین پر ایک لفظ نہ نکالو۔

پریکٹس

محمد امین آسی

یہ معروف مقولہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا ''پریکٹس میکس دی مین پرفیکٹ'' (Practice makes the man perfect) یعنی کسی کام کا بار بار کرنا یا دہرانا آپ کو اس کام کا ماہر بنا دیتا ہے۔

اسی طرح کنگ فو کی فیلڈ میں ایک چینی کہاوت ہے کہ ''مجھے ان ایک لاکھ داؤ سے خطرہ نہیں ہے جو تم نے ایک بار پریکٹس کیے ہیں مجھے تو اس ایک داؤ سے خوف ہے جو تم نے ایک لاکھ بار پریکٹس کیا ہے''

ایک اور مشہور مقولہ یہ بھی ہے کہ ''ہم پہلے اپنی عادات بناتے ہیں اور پھر وہ عادات ہمیں بناتی ہیں۔'' گویا پہلے ہم کسی کام کو بار بار کر کے اس کی عادت ڈال لیتے ہیں مگر پھر وہی عادت ہماری مستقل صفت بن کر ہماری شخصیت کا تعارف بن جاتی ہے............

یہ تمام اور اس جیسے اور بہت سے اقوال و کہاوتیں دراصل ایک ہی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہیں اور وہ یہ کہ کسی بھی کام کی بار بار پریکٹس آپ کو اس خاص کام کا ماہر بنا دیتی ہے۔ اب سوال صرف اتنا ہے کہ آپ اپنی زندگی میں آج تک کیا پریکٹس کرتے رہے ہیں؟

اگر آپ شکایت پریکٹس کرتے آئے ہیں تو کچھ ہی عرصے میں آپ اس میں ایسے ایکسپرٹ ہو جائیں گے کہ جلد ہی لوگوں سے، معاشرے سے، رشتوں سے اور خدا سے آپ کو طرح طرح کی شکایات ہونے لگیں گی۔ اگر آپ تنقید پریکٹس کرتے آئے ہیں تو یقین نیے کہ جلد ہی آپ تنقید کے اتنے بڑے ماہر بن جائیں گے کہ مثبت سے مثبت ترین بات میں بھی تنقیدی پہلو ڈھونڈ نکالیں گے۔

اگر آپ سکون پریکٹس کرتے آئے ہیں تو بہت جلد آپ سخت سے سخت حالات میں بھی سکون کا پیغام بنے نظر آئین گے۔

اگر آپ مثبت رویہ پریکٹس کرتے آئے ہیں تو مشکل سے مشکل حالات میں آپ کا یہ رویہ آپ کو بہت سی پیچیدگیوں سے بچالے گا۔

سوال بہر حال یہی ہے کہ آپ کیا پریکٹس کرتے آئے ہیں اور کر رہے ہیں؟............!!

☆......☆

کچھ تلخ حقائق

تنزیلہ حق (سابقہ طالب علم)

☆ نمبر ایک

مسجد بھی کیا عجیب جگہ ہے جہاں غریب باہر اور امیر اندر بھیک مانگتا ہے۔

☆ نمبر دو

بارات میں دولہا پیچھے اور دنیا آگے چلتی ہے جبکہ میت میں جنازہ آگے اور دنیا پیچھے چلتی ہے۔ یعنی دنیا خوشی میں آگے اور غم میں پیچھے ہو جاتی ہے۔

☆ نمبر تین

موم بتی جلا کر مردوں کو یاد کرنا اور موم بتی بجھا کر سالگرہ منانا۔

☆ نمبر چار

عمر بھر بوجھ ایک کیل نے اٹھایا اور لوگ تعریف تصویر کی کرتے رہے

☆ نمبر پانچ

پازیب ہزاروں روپے میں آتی ہے، پر پیروں میں پہنی جاتی ہے اور بندیا ایک روپے میں آتی ہے مگر پیشانی پر سجائی جاتی ہے اس لیے قیمت معنی نہیں رکھتی قسمت معنی رکھتی ہے۔

☆ نمبر چھ

نیم کی طرح کڑوا علم دینے والا ہی سچا دوست ہوتا ہے۔ میٹھی بات کرنے والے تو چاپلوس بھی ہوتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ آج تک نیم میں کبھی کیڑے نہیں پڑے اور مٹھائی میں تو اکثر کیڑے پڑ جایا کرتے ہیں۔

ت نمبر سا☆

اچھے راستے پر کم لوگ چلتے ہیں لیکن بُرے راستے پر اکثریت چلتی ہے۔

☆ نمبر آٹھ

سب سے پیاری بات جو مجھے بہت پسند آئی

شراب بیچنے والا کہیں نہیں جاتا، مگر دودھ بیچنے والے کو گھر گھر اور گلی کوچے بھٹکنا پڑتا ہے۔

شان صحابہ

محمد مجتبیٰ حسن (سابقہ طالب علم)

وہ ابتدا میں چار تھے
دار ارقم میں 45 ہو گئے
شعب ابی طالب میں 82
ہجرت کے وقت وہ 115
غزوہ بدر میں 313
پھر رفتہ رفتہ بڑھتے چلے گئے
صلح حدیبیہ میں تعداد 1400 ہوئی
فتح مکہ پر 10 ہزار
غزوہ حنین میں 12 ہزار
غزوہ تبوک میں 40 ہزار
خطبہ حجۃ الوداع میں ان کی تعداد 70 ہزار سے زیادہ
حضور اکرم ﷺ کے وصال کے وقت یہ سوا لاکھ تھے
عرصہ 23 سال میں اس قدر افرادی قوت کسی اور مذہب کا اعجاز نہیں
یہ امتیاز صرف اسلام کو ہی حاصل ہے
وہ لوگ اسلام میں اس قدر گھل مل گئے تھے کہ وہ خود اسلام نظر آتے تھے
مٹی کے بنے مگر پرواز آسمان پر، موت ان سے ڈرتی تھی، وہ زمانے کو مسخر کرتے تھے
جن کا رب اللہ
جن کا مدرسہ بیت اللہ
جن کے استاد رسول ﷺ

جن کا نصاب کتاب اللہ

جن کا ممتحن خود اللہ

نتیجہ رضی اللہ عنہ

صحابہ خود حزب اللہ

اللہ عزوجل ہمیں بھی صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سا ایمان اور جذبہ عطا کرے اور جو اُن سے بغض رکھے اللہ ان پر اپنا قہر نازل فرمائے! آمین

☆......☆

اُف! آدھی رات گزر چکی ہے اور اڑھائی بجنے کو ہیں۔ سکون محال ہے اور بے چینی کا دور دورہ ہے کسی پل بھی قرار میسر نہیں۔ زندگی میں تمہارے بغیر کوئی مزا نہیں۔ واقعی تمہارے بغیر میں بالکل جی نہیں سکتا۔ میرے موبائل کی بیٹری بھی ختم ہو چکی ہے۔ نیند حرام ہو گئی ہے۔ آخر تم مجھے اتنا کیوں تڑپاتی ہو۔ آ کیوں نہیں جاتی۔ بتاؤ تو سہی آخر کب آؤ گی تم۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ تمہارے بغیر زندگی تاریک ہے۔ اب بجلی؟ آ بھی جاؤ۔ آ کر میری زندگی روشن کرو۔

محمد ولایت رضا (سابقہ طالب علم)

روشنی

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی نے اپنے حلقہ ارادت میں بیٹھے ہوئے مریدوں سے پوچھا ''روشنی'' کب آتی ہے؟؟؟

ایک مرید نے بڑے ادب سے جواب دیا: ''حضرت جب سفید اور سیاہ دھاگے میں فرق نظر آنے لگے یہی روشنی ہے۔''

دوسرے مرید نے عرض کی ''حضور جب دور کے درختوں کو دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ بیری کا درخت کون سا ہے اور شیشم کا درخت کون سا تو سمجھے یہ روشنی ہے۔''

مرشد نے یہ جواب سن کر دیگر حاضرین کی طرف نظر دوڑائی، کسی اور کے پاس کہنے کو مزید کچھ نہ تھا، اس پر مرشد نے ارشاد کیا:

''جب تم ضرورت مند کے چہرے پر اس کی ضرورت پڑھ سکو تو جان لو کہ ''روشنی'' آ چکی ہے!

☆......☆

ایکسرے کیا ہے؟

مہتاب علی (سال چہارم)

ایکسرے تیز رفتار شعاعوں کا وہ نظام ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی خفیہ چیز کا صحیح عکس سلولائیڈ پر منتقل کرلیا جاتا ہے۔ ان شعاعوں کی قوت نفوذ (پہنچنے کی قوت) اتنی طاقت ور اور تیز ہوتی ہے کہ یہ گوشت اور سخت ہڈیوں کے علاوہ بعض ٹھوس دھاتوں میں سے بھی با آسانی گزر جاتی ہیں۔ ایکسرے سے زیادہ تر کام میڈیکل کی دنیا میں لیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کی ہڈی ٹوٹ جائے تو ایکسرے لینے کے بعد یہ صاف پتا چل جاتا ہے کہ ہڈی کہاں سے اور کتنی ٹوٹی ہے۔ اس ایجاد سے پہلے کسی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنا صرف ایک اندازے سے ہوتا تھا۔ اسی طرح اگر کوئی دانت ٹوٹ جائے تو اس کی ٹوٹی ہوئی جڑ کا پتا بھی ایکسرے کے ذریعے لگایا جاسکتا ہے۔ 1896ء میں ''ڈبلیو کے رونجتن'' نے ایکسرے دریافت کر کے طب کی دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ ایکسرے شعاعوں کے ذریعے ڈاکٹروں نے انسانی جسم کے اندر پوشیدہ کئی مہلک اور خطرناک بیماریوں کا پتا چلا کر ان کا صحیح علاج کیا۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں انسانی ضرورتوں کا دائرہ پھیلتا گیا، ایکسرے کے فوائد میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا، چنانچہ ڈاکٹروں کے علاوہ کاروبار اور صنعت کے میدان میں بھی اس مفید ایجاد نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے، مثلاً کسی پیکٹ یا بند چیز کو کھولے بغیر ایکسرے کی مدد سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر کیا چیز ہے؟ یہ کام زیادہ تر ملک کی اہم بندرگاہوں، ہوائی اڈوں اور سرحدوں پر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایکسرے سے دھاتوں کے جوڑ، اصلی اور نقلی ہیروں کی پہچان میں بھی بہت سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ آج کل یہ ایجاد اتنی اہمیت اختیار کر گئی ہے کہ کسی بھی مریض کا علاج کرنے سے قبل، اسے ایکسرے مشین کے سامنے ضرور لایا جاتا ہے۔ ایکسرے ہی کی ایک اور جدید قسم ''الٹرساؤنڈ'' بھی ہے۔

☆ لوگوں کے درمیان انصاف کیا کرو۔

☆ مرنے والے کی دولت خاندان کے تمام ارکان کے درمیان تقسیم کیا کرو۔

میرے کیا کہنے

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین راشد
صدر شعبہ اُردو

کل شام اپنے جگری یار گلریز سے امریکا بات ہو رہی تھی۔ وہ بلا کا حاضر جواب اور ہنس مکھ ہونے کے ساتھ ساتھ جگت بازی میں بھی طاق ہے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا دنیا میں پاکستان کی بڑی عزت ہونے لگی ہے۔ امریکا افغانی دلدل سے نکلنے کے لیے پاکستان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ عرب و فارس بھی اپنے مسائل کے حل کے لیے پاکستان سے آس لگائے بیٹھے ہیں، دنیا کے اہم فوروموں پر وزیرِاعظم ملک و قوم کا مقدمہ بڑے احسن اور مؤثر انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ یارا پاکستان کی تو عزت بڑھ رہی ہے۔ کیا پاکستانی بھی کچھ سمجھدار ہوئے ہیں یا ابھی بھی چائے میں بسکٹ ڈبو کر ہی کھاتے ہیں؟ ہاہاہا۔ پھر حسب عادت گلریز کا ایک لمبا قہقہہ۔

رات گئی بات گئی کے مصداق میں صبح جاگا تو گلریز کے چٹکلے بھول چکا تھا۔ تیار ہو کے اور ناشتا کر کے ڈیوٹی پر جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ٹرین کی آمد آمد تھی اور پلیٹ فارم پر خوب رونق اور چہل پہل تھی۔ سب کی نظریں اس افق پر جمی تھیں جہاں سے گاڑی نے نمودار ہونا تھا۔ اچانک ہڑبونگ مچ گئی۔ گاڑی کی لائٹ اور سائرن نے مسافروں کو چوکنا کر دیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ بہت زیادہ بھیڑ نہیں تھی اور گاڑی اس اسٹیشن پر دو منٹ کے لیے رکتی تھی۔ بد نظمی، دھینگا مشتی اور ایک طوفان بدتمیزی۔ ہر ڈبے کے دروازوں پر ایک سا منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ سوار ہونے والے چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد سوار ہو جائیں اس سے پہلے کہ گاڑی چھوٹ جائے۔ اترنے والوں کی الگ بپتا کہ پہلے ہمیں اتر لینے دیں۔ ''اندھے ہوئے ہو، آگ لگی ہے، تیرے باپ کی گاڑی ہے، کبھی پہلے گاڑی نہیں دیکھی۔'' بھانت بھانت کی بولیاں اور دھکم پیل کہ الامان الحفیظ۔ گاڑی چلنے سے پہلے دو جگہ جوتا چلا اور زبان کا چلنا تو کوئی قابل ذکر بات ہی نہیں۔

ایک عورت کے دو بچے سوار ہونے سے رہ گئے۔ ایک بڑے میاں کا سامان انھیں دغا دے گیا۔ وہ جیسے کیسے خود تو سوار ہو گئے لیکن ان کا بیگ اس دھکم پیل میں پائیدان کے نیچے گہرائی میں جا گرا اور وہ من من کی گالیاں دیتے واپس اُتر رہے ہیں۔ گاڑی چل دی اور شور محشر گویا تھمنے لگا۔ ٹرین کے ہر ڈبے کے کم از کم چار اور بعض صورتوں میں آٹھ دروازے ہوتے ہیں۔ نصف دروازوں پر اُردو اور انگریزی میں ''داخلہ'' یعنی "Enterance" بہ حروف جلی لکھا ہوتا ہے اور بقیہ نصف پر جلی حروف میں ''خروج'' یعنی "Exit" رقم ہوتا ہے۔ ہر ڈبے میں اتنے زیادہ دروازوں کے ہوتے ہوئے جوتا جاتی اور دھکم پیل کا کیا

ٹک۔ مجھے شریر گلریز یاد آ گیا۔

دفتر سے واپسی پر مجھے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق اگر دن میں بارہ چودہ گلاس پانی پیا جائے تو کبھی کبھار راستے میں بھی ایسی صوت حال کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ میں نے ریلوے اسٹیشن پر ہی بائیک روکی اور ''مردانہ'' کی طرف بڑھا۔ ایک قطار میں چار واش روم مردانہ ایک طرف اور دوسرے ہاتھ اتنے ہی ''زنانہ''۔ نہایت پھرتی سے میں نے قریب ترین یعنی پہلے واش روم کا دروازہ کھولا۔ لاحول ولا قوۃ۔ بدبو کے بھبھوکے اور نا قابل بیان منظر۔ میں ناک پر ہتھیلی رکھ کر دوسرے واش روم کی طرف لپکا۔ منظر پہلے سے بھی بدتر۔ تیسرے واش روم کا فرش پانی کے تالاب کا منظر پیش کر رہا تھا جس میں جا بجا مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ پیلی اور انسانی خورونوش سے تخلیق ہونے والی۔ آخری آس چوتھا واش روم۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ تمام ہمت مجتمع کر کے چوتھے میں داخل ہونے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی مہربان ابھی ابھی پاٹ کے بجائے فرش پر ہی گل کھلا کے تشریف لے جا چکے تھے۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ہم نے بھی باہر کی راہداری میں ایک مناسب سا کونا دیکھا اور کھڑے کھڑے ہی دیوار میں اُگے ایک چھوٹے سے پیپل کے درخت پر آب پاشی کر دی۔ ویسا سلوک جیسا ہمارے ایک صدر مملکت جناب آغا یحیٰی خاں نے ایران میں ہوائی اڈے کے لان میں لالہ وگل سے کیا تھا۔ ہماری طرح کسی ویران کونے میں دبک کر نہیں بلکہ تمام غیر ملکی وملکی مہمانان گرامی کے بالکل سامنے کھلے بندوں۔ وہ مہمان جو شاہ ایران کی وفات پر سرکاری طور پر منعقد ہونے والی تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ بہر حال شاہوں کے انداز شاہانہ۔ کنکھیوں دیکھتے ہم باہر پلیٹ فارم پر آئے اور ایک نل سے ہاتھ دھوئے۔ ابر آلود موسم اور ہلکی ہلکی ہوا۔ چند منٹ کے لیے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ یارِ طرحدار اور شاہِ اشرار گلریز خان کی کال۔ میں نے بتایا کہ سندر موسم میں ریلوے اسٹیشن پر اس سیٹ پر براجمان ہوں جو ہم دونوں کا پسندیدہ کنج تنہائی تھا۔ چھوٹتے ہی بولے ''اخے کیا پاکستانیوں کو ٹرین چڑھنے اترنے اور باتھ روم استعمال کرنے کا طریقہ آ گیا ہے؟ ہاہاہا............ لمبے اور بھرپور قہقہوں کی برسات۔ رم جھمی رُت میں شام ڈھلے میں نے گھر کی راہ لی۔ میں سوچ رہا تھا ٹرین پر سوار ہونا تو کبھی کبھار ہوتا ہے اور بعض لوگوں کو تو عمر بھر اس کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن حوائج ضروریہ کے لیے تو ہر انسان کو دن میں تین چار بار واش روم جانا پڑتا ہے۔ کیا ہمیں اس کا بھی سلیقہ نہیں۔ کیا یہ نہایت بنیادی چیز بھی سکھانے کے لیے ہمیں کسی ادارے میں داخلہ لینا پڑے گا۔ کیا ہمیں اپنے کیے پر پانی بہانے کا ڈھنگ بھی اغیار سے سیکھنا ہوگا۔ ہم تو الطھور نصف الایمان اور الطھور شطر الایمان کے داعی ہیں۔ کاش یہ غیرت مند قوم پبلک باتھ روم میں فطرت کو جواب دیتے ہوئے ''شیعہ کافر''، ''قادیانی کافر'' ''............مردہ باد'' کی graffiti میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بجائے صفائی کو نصف نہیں پورا ایمان بنا لے۔

نمازِ عصر کی ادائیگی کے بعد مسجد سے باہر آتے ہوئے ضروریز نے میرے کان میں بتایا کہ انکل نثار کئی دنوں سے علیل ہیں۔

کیوں نہ ان کی تیمارداری کے لیے چلیں، بھائی ارشد بھی ہمارے ہمراہ ہیں۔ انکل نثار ہمارے محلے کی ایک ہر دل عزیز شخصیت ہیں۔ منشیانے کا کام کرتے ہیں۔ دو ہفتے سے صاحبِ فراش تھے۔ اس سے پہلے بھی ہم ایک دو دوست ان کی بیمار پرسی کے لیے جا چکے تھے۔ یہ خلیق و نفیس انسان اپنے اچھے اخلاق اور ملنساری کی وجہ سے پورے محلے بلکہ اس سے بھی آگے تک انکل کے سابقے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے سب نے ''انکل'' ہی سے پکارتے ہیں۔ گلریز تو انھیں انکل سام کہتا ہے۔
ہم باتیں کرتے ہوئے دو گلیاں پرے فیملی پارک کے سامنے واقع انکل نثار کے مختصر سے مکان کے باہر کھڑے تھے۔ گھنٹی بجانے کی ضرورت اس لیے پیش نہ آئی کہ انکل کے لیے گھر والوں نے بیٹھک میں چارپائی لگا دی تھی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی باہر سے کھلا تھا اور اک دبیز پردے کے پیچھے سے باتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ انکل کے پاس دن بھر بیمار پرسی کرنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ پردہ اٹھا، السلامُ علیکم کہتے ہوئے ہم بھی کمرے کے اندر داخل ہوئے اور انکل کے قریب پڑی خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انکل کے چہرے پر نقاہت اور ضعف کے آثار نمایاں تھے۔ پہلے سے بیٹھے دو احباب چائے سڑکتے ہوئے انکل کو اپنے ان رشتہ داروں کی موت کا احوال بتا رہے تھے جو ان کے بقول اسی بیماری میں اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ ایک صاحب تو اپنی ماہرانہ رائے دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ بیماری نے جس قدر کمزوری پیدا کر دی ہے اس کے دور کرنے کے لیے سالوں درکار ہوں گے۔ ارشد بھائی نے بھی شریک گفتگو ہوتے ہوئے کہا کہ انکل کی آنکھوں کے گرد بننے والے سیاہ حلقے ٹھیک نہیں ہیں۔ ضوریز پیچھے کیوں رہتا۔ بولا انکل جی بیماری نے تو آپ کی ہیئت ہی بدل دی ہے۔ پہچانے نہیں جا رہے۔ رنگ بھی سنولا گیا ہے۔ پہلے سے موجود دونوں اصحاب چائے اور بسکٹ پر ہاتھ صاف کر کے اٹھے اور الوداعی کلمات ادا کرتے ہئے رخصت ہونے لگے۔ ''انکل جی کوئی بات نہیں آپ کے گناہ جھڑ رہے ہیں۔ اللہ بیلی''۔ انکل کا بیٹا اسی اثنا میں ہمارے لیے بھی چائے لے آیا۔ اگرچہ اصرار کرتا رہا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔
''انکل پچھلے ہفتے سے ماشاءاللہ آپ کی صحت کافی بہتر لگ رہی ہے۔ چہرہ بھی ہشاش بشاش ہے۔'' میں نے جونہی یہ کہا انکل بستر پر اٹھ بیٹھے اور ان کے منہ پر ایک رونق سی دکھائی دینے لگی۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''راشد میاں! اب تو میں آدھی آدھی روٹی بھی دو وقت کھانے لگا ہوں۔'' ''لو جی! پھر تو ستے خیراں انکل جی! سیانے کہتے ہیں جب مریض روٹی کھانے لگ جائے تو پھر اسے مریض نہیں کہنا چاہیے وہ بحال ہو رہا ہوتا ہے۔ ماشاءاللہ مجھے تو آپ بالکل پہلے جیسے لگ رہے ہیں۔ ذرا سی کمزوری ہے جو ہفتہ دس دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔'' انکل کی طبیعت بحال ہو چکی تھی اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا ''چھوٹے گوشت کا قیمہ کھا رہا ہوں اور اب تو دیسی مرغ کو بھی من چاہتا ہے''۔ ''انکل جی! دیسی مرغ میرے ذمے، ابھی پہنچ جائے گا لیکن شرط ہے کہ ہم دونوں نے مل کے کھانا ہے۔'' میری بات پر انکل سمیت سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کل ملنے کا وعدہ کر کے ہم وہاں سے چل دیے۔ دم رخصت خاموشی سے میں نے انکل کے تکیے تلے پانچ سو کا ایک نوٹ

رکھ دیا۔ضوریز نے بھی میری پیروی کی اور ہم نے گھر کی راہ لی۔ راستے میں مَیں سوچ رہا تھا کیا ہمیں ایک بیمار انسان کی ڈھارس بندھانے کا قرینہ بھی نہیں آتا۔ کیا ہم لوگ بیمار پرسی کے نام پر مریض کو مزید پریشان حال کر کے نہیں چھوڑتے۔ امریکا والے مریض کے سامنے ہنستے اور چہلیں کرتے ہوئے کہتے ہیں Get well sooh اور یورپ میں عموماً Wish u Speedy Recovery کے الفاظ سے دعا دی جاتی ہے اور ہمارے ہاں وقت بے وقت عیادت جانا، حسب حیثیت مریض کی خدمت کرنے کے بجائے اسے کہنا کہ تم تو بہت کمزور اور لاغر ہو گئے ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ اسلام کا چلن تو ہرگز نہیں۔ پیارے آقا ﷺ نے تو گم شدہ بچے کے باپ کو منع کر دیا تھا کہ وہ جب بچے کو دوسرے بچوں میں پائے تو ''میرا بیٹا، میری جان'' مت کہے۔ مبادا یتیم بچے کو اس کی یتیمی کا احساس غمگین کر دے۔ دین اسلام تو جذبات و احساسات کے احترام کا درس دیتا ہے۔ دکھی کے لیے تسلی اور تشفی کے بول۔ اگر مریض کو چار لوگ یہ کہہ دیں کہ وہ روبہ صحت اور چنگا بھلا ہے تو وہ نفسیاتی طور پر مضبوط اور واقعی صحت مند ہو جائے گا۔ اور اس کے برعکس الفاظ اسے لب گور لے جائیں گے۔ میری سماعتوں میں گلریز کے الفاظ گونجنے لگے ''کیا ہمیں تیمارداری کرنی آتی ہے؟''

کرونا میں جو روپ میری دھرتی پہ دیکھے گئے شاید پوری دنیا میں کہیں ان کا ظہور نہ ہوا ہو۔ اس عالمی وبا نے لاکھوں انسانوں کو پیوند خاک کر دیا۔ چین سے شروع ہونے والا یہ وائرس آناً فاناً تمام روئے ارض پر پھیل گیا اور لوگ خزاں گزیدہ پتوں کی طرح جھڑ کر لقمہ اجل بننے لگے۔ چین والوں نے تو کمال احتیاط و مہارت سے اس عفریت پر قابو پا لیا اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اور ماہرین طب نے بتایا کہ اس وائرس کا واحد علاج احتیاط، سماجی فاصلہ، صفائی اور خود کو محدود رکھنا ہے۔ ہم پاکستانی بھلا یہ سب کچھ کیسے کر سکتے ہیں؟ سچ پوچھیے یہ احتیاط اور فاصلہ ہمارے مزاج سے لگا نہیں کھاتا۔ ملک بھر میں بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دینے لگیں۔ حکومت مخالفوں نے اسے یہودی لابی اور عمران خان کی کارستانی قرار دیا۔ بہت سے علما نے اسے اسلام کے خلاف سازش کہا۔ بعضوں نے تو اسے محض ایک نوٹنکی اور ڈراما کا نام دیا۔ بہت سوں نے کرونا نام کی بیماری پر یقین رکھنا خدا سے عدم یقین کے مترادف گردانا۔ کچھ بقراطوں نے اسے حکومت کا قرضہ معاف کرانے اور امداد حاصل کرنے کا بہانہ سمجھا۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ میں نے دیہات میں لوگوں کو اس کا مذاق اڑاتے دیکھا۔ لوگ زبردستی مصافحہ کرنے سے نہ چوکتے خواہ فریق ثانی اس سے دامن کشاں ہو۔ علما خم ٹھونک کر سامنے آ گئے اور مساجد کی تالا بندی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ باوجود اس حقیقت کے کہ تمام عرب ممالک مصر، ایران، انڈونیشیا، ملائیشیا نے مساجد کی تالا بندی کر دی اور سعودیہ نے تو کعبۃ اللہ اور روضہ رسول کو بند کرتے ہوئے اس سال حج عمرہ نہ کروانے کا اعلان بھی کر دیا لیکن ہمارا ملا تو حکومت کے خلاف طبلِ جنگ بجا چکا تھا۔ ڈھاک کے تین پات، انھوں نے مساجد کی تالہ بندی نہ ہونے دی۔ سوشل میڈیا پر اسے تضحیک کا نشانہ بنایا گیا، ''مجھے گولی مار دینا چوک میں اگر کسی کو مصافحہ کرتے کرونا ہو جائے۔''، ''جمعہ کے بعد

تمام مسلمان بھائی مصافحہ معانقہ کر کے جائیں اگر کسی کو کچھ ہو جائے تو مجھے آ کر پکڑ لینا'' اس جیسی بے شمار پوسٹیں دیکھنے کو ملیں۔ چین، ایران، اٹلی، سپین، انگلینڈ، انڈیا اور امریکا میں اس کی تباہ کاریوں نے عوام اور حکومت کو غم و یاس کی تصویر بنا دیا۔ وہ بے بسی سے اپنے پیاروں کے جنازوں کو کندھا دے دے کر غم سے نڈھال ہو گئے۔ کروڑوں متاثرین اور دس لاکھ سے زائد اموات۔ الامان الحفیظ۔ لیکن ہمارے عوام اور مولوی یہی کہتے دکھائی دیے ''اجی یہ سب بکواس ہے اور امریکا کی سازش ہے۔'' ''ہمارے ڈاکٹر فضول میں لوگوں کو ٹیکے لگا کر خود مار رہے ہیں۔'' دوسری طرف ہماری غیور عوام نے اس خدائی عذاب میں بھی منافع خوری کے رستے پیدا کر لیے۔ ماسک اور سینی ٹائزر پانچ گنا قیمتوں پر بکنے لگے۔ کوئی چیز یا دوا جو اس سلسلے میں معاون ہو سکتی تھی مارکیٹ سے راتوں رات نایاب ہو گئی اور اس کے دام آسمانوں کو چھونے لگے۔ مکہ، مدینہ، ماشاءاللہ جنرل اور میڈیکل اسٹور کے الحاج مالکان نے لاکھوں کی دہاڑیاں لگائیں۔ حکومت نے پٹرول سستا کیا تو ذخیرہ کر لیا گیا اور عوام کو 75 کے بجائے سو اور بعض جگہوں پر 200 روپے کا لٹر ڈلوانا پڑا۔ چینی آٹا بازار سے غائب کر کے نظر نہ آنے والے ہاتھوں نے کروڑوں گول کیے۔ یہ مافیا کوئی کافر یا ہنود و یہود نہیں، امریکا، یورپ یا اسرائیل کا پروردہ نہیں۔ ہمارے اپنے تجار، مل مالکان، سرکاری کارندے اور نہایت فرشتہ صورت صوم وصلوٰۃ کے پابند لوگ ہیں۔ ہم خود ہیں۔ ہم بھی تو غیر ضروری خریداری کر کے اس بحران کی شدت میں اضافہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

؎ میں کس کے ہاتھ میں اپنا لہو تلاش کروں
کہ سارے شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

سات سمندر پار امریکا میں بیٹھا گلریز پاکستان اور پاکستانیوں کی پل پل کی خبر رکھتا ہے اور مجھے چھیڑتے ہوئے دوسرے تیسرے دن پوچھتا ہے کہ کیا پاکستانیوں نے کرونا سے لڑنا سیکھ لیا ہے۔ میں کڑھتا ہوں کہ کیا ہم اپنی حرام کاریوں کا الزام دوسروں کے سر تھوپ کر یونہی جیے جائیں گے۔

میری موبائلی قوم دن رات چھکا چھک موبائل فون چلاتی ہے۔ یہ الفاظ میرے نہیں شرارتی گلریز کے ہیں۔ جو امریکا کیا گیا ہمیں غیر مہذب سمجھنے لگ گیا۔ کہتا ہے پاکستانیوں کے گھر میں روٹی کی فکر بعد میں پہلے ٹچ موبائل کا ہونا ضروری ہے۔ جب صبح و شام، دن رات اپنے ہاں موبائل فون کا بے دریغ استعمال دیکھتا ہوں تو لگتا ہے گلو بھائی کچھ اتنے غلط بھی نہیں۔ ٹریفک سارجنٹ فون کان سے لگائے ڈیوٹی کر رہا ہے؛ ڈاکٹر کانوں میں ہینڈ فری لگائے مسیحائی کرتا نظر آتا ہے؛ استاد و شاگرد بلا جھجھک کلاس روم میں موبائل فون لے جاتے ہیں اور عمل تدریس کے دوران میں Chat سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مسجد مین دورانِ جماعت کبھی امام اور کبھی مقتدیوں کی فون کی رنگ برنگی گھنٹیاں بجتی سنائی دیتی ہیں؛ چھوٹے منے کو دودھ بسکٹ نہ دو، فون دے دو سارا دن آپ کو تنگ نہیں کرے گا؛ ماں بیٹی فون پر سسرال والوں کے فرضی ظلم پر روزانہ گھنٹوں جہادی گفتگو کرتی

ہیں اور آخری جملہ یہ ہوتا ہے اچھا فارغ ہو کے تفصیل سے بات کروں گی۔لڑکے بالے گلی چوراہوں میں کان میں ٹونٹیاں لگائے دنیا و مافیہا سے بے خبر چھکا چھک نیٹ چلا رہے ہیں۔Time is money کی دھجیاں اڑانے کے بعد اب ان کا فقرہ ہے Money is nothing اپنا پیٹ بھرا ہو نہ ہو فون بیلنس سے ضرور بھرا ہوگا اور اسے ہمہ وقت بھرا رکھنے کے لیے دکاندار کو ایڈوانس رقم جمع کروائی ہوتی ہے کہ وہ نا ہنجار ادھار یا کال پر لوڈ نہیں کرتے۔لڑکیاں تو بظاہر فون کا اس شد ومد سے استعمال کرتی نظر نہیں آتیں لیکن ایک صدا ایک فی صد لاسلکی کے دوسرے سرے پر جنسِ مخالف ہی کانوں میں رس گھول رہی ہوتی ہے۔ڈرائیور تک جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈرائیونگ کے دوران میں اپنے پیاروں کے حال سے باخبر ہوتے ملیں گے۔فون میں انٹرنیٹ کی سہولت نے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دیا اور اب تو ہاتھ میں فون ہو اور تن میں خون ہو،کوئی مداخلت نہ کرے۔سیل فون decorum کس چڑیا کا نام ہے ہمیں اس سے کیا علاقہ۔سوچتا ہوں کہ گاڑی چلانے،جہاز اڑانے اور بندوق اٹھانے کے لیے ایک لائسنس ہوتا ہے اور اس کے بغیر یہ عمل غیر قانونی اور جرم قرار پاتا ہے۔یہ لائسنس سخت ریاضت، پریکٹس اور مہارت حاصل کرنے کے بعد ہی جاری ہوسکتا ہے۔کیا فون کا استعمال بغیر پریکٹس اور مہارت حاصل کرنے کے یونہی شروع کر دیا جائے'' حالانکہ یہ بھی تو قتل کرتا ہے تلوار کی طرح''۔آج ہماری کلاس،مسجد،کچہری،دفتر،ہسپتال،سڑک حتیٰ کہ گھر تک اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں۔اہل مغرب کے ہاں اس کے باقاعدہ آداب اور قرینے ہیں،سیل فون کو ذاتی یا پرائیویٹ پراپرٹی سمجھا جاتا ہے اور بلا اجازت یا وقت لیے بغیر موبائل فون پر کال کرنا بدتمیزی اور بدتہذیبی کے زمرے میں آتا ہے۔انھوں نے یہ ضابطۂ اخلاق بنالیا ہے کہ موبائل فون صرف ذاتی اور نجی استعمال کے لیے مخصوص ہے۔سرکاری،دفتری یا پیشہ ورانہ امور لینڈ لائن فون پر دفتری اوقات کار کے دوران میں نپٹائے جائیں۔جیسے محاورۃً کہا جاتا ہے کہ موت اور گاہک کا کوئی وقت مقرر نہیں کچھ ایسے ہی پاکستانیوں کے فون کسی وقت بھی اور کہیں بھی تھرتھرانا اور شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔صبح، دوپہر،شام،دن،رات،گھر،دفتر،باتھ،سڑک،کلاس،آپریشن تھیٹر،مسجد،سفر،حضر کون سی جگہ ہے جہاں ہمارے ہاں فون بلا روک ٹوک استعمال نہیں ہو رہے۔لگتا ہے کہ ہر پاکستانی فون سننے اور کرنے کی ڈیوٹی پر بطور آپریٹر چوبیس گھنٹے مامور ہے اور دیگر ذمہ داریاں ثانوی اہمیت کی حامل ہیں۔پھر ہمارا اندازِ تکلم فون پر کچھ زیادہ ہی شوریلا ہوتا ہے۔چیخ چیخ کر فون پر بات کرنا کہ اردگرد پانچ سو گز تک عوام الناس کو پتا چل جائے کہ کوئی فون کر رہا ہے۔یہ سمع خراشی کتنوں کے لیے سوہانِ روح ہوتی ہے۔نرماہٹ اور ملائمت کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔مس کالیں مارنا بھی ہمیں مرغوب ہے۔اگر ہماری ان اداؤں سے کوئی پریشان ہوتا ہے تو ہوتا پھرے۔یہ اس کا مسئلہ ہے۔گلریز کا سوال تشنۂ جواب ہے کیا ہمیں موبائل فون استعمال کرنا آتا ہے؟

ووٹ کے استعمال میں بھی ہم سا کوئی دنیا میں نہیں ملے گا۔ووٹ کی پرچی میں ایٹم بم سی طاقت مخفی ہوتی ہے۔اس کا درست یا غلط استعمال قوموں کے مقدر سنوارتا یا گہناتا ہے۔مہذب دنیا اکثر اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے پروفیسروں کو بطور

حکمران چن لیتی ہے۔امریکا، برطانیہ، ایران، نیوزی لینڈ، سویڈن کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ انتہائی پڑھے لکھے بااعتماد لوگ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے ہیں اور اپنی بات منوانے کی صلاحیت سے متصف ہوتے ہیں۔حکمران قوم کا آئینہ ہوتے ہیں۔جیسے عوام ویسے ان کے حکمران۔جیسا منھ ویسے تھپیڑے۔ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ **عـمّـا لكم اعمالكم**۔ ''تمھارے عمل ہی تمھارے حکمران ہیں''۔ میں جب اپنے عوام کو خربوزوں کے ٹھیلے پر خریداری کرتے دیکھتا ہوں تو ان کے حسن انتخاب واحتیاط کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔دوسیر خربوزے لیتے ہوئے وہ ساری ریڑھی چھان مارتے ہیں۔سونگھ سونگھ کے اور دبا دبا کے ایک ایک دانہ دیکھتے ہیں، تب کہیں جا کر خریدنے کی نوبت آتی ہے۔تربوز لیتے وقت مجال ہے وہ اسے بغیر ٹکی کے قبول کر لیں۔تربوز فروش لاکھ یقین دلائے اور قسمیں کھائے وہ عین الیقین سے سرِ مو پیچھے نہیں ہٹتے۔تربوز کو کٹ لگوا کر اپنی آنکھوں سے اسے ''لال سُوا'' دیکھ کر پھر خریدتے ہیں۔گھڑا اور ہنڈیا جس کا رواج ختم ہونے کے بعد پھر سے شروع ہو چکا ہے خریدتے وقت بھی ان کی کمال احتیاط دیدنی ہوتی ہے۔خوب ٹھوک بجا کر اس کے ایک ایک مسام کا بغور جائزہ لینے اور اس کے پیندے کو گنجے کا سر سمجھ کر خوب ٹھونگیں مارنے کے بعد کہیں جا کر خریدنے کی نوبت آتی ہے۔الغرض سبزی ترکاری، اشیائے خورونوش، کپڑا جوتا اور دیگر اشیائے ضروریہ کی خریداری ہم سخت احتیاط اور چوکنے ہو کر کرتے ہیں۔لیکن ووٹ کا معاملہ کچھ مختلف ہے۔یہ ہم بس دے ہی دیتے ہیں کبھی برادری کے نام پر تو کبھی علاقے کو سامنے رکھتے ہوئے، کوئی بغل گیر ہو گیا تو ہم نے اپنا ووٹ اس کے نام کر دیا۔کوئی گھر آ گیا اور جتلا دیا کہ ہمارا تو آپ سے اور آپ کے بزرگوں سے گہرا رشتہ ہے۔تو ہم نے یہ اس رشتے پر وار دیا۔کسی نے ہمارے بچوں سے اظہار شفقت کرتے ہوئے انھیں سائیکل یا خواتین کو سلائی یا دھلائی مشین دے دی یا پھر راشن کا تھیلا ہمارے گھر پہنچا دیا تو ہم مارے مروت کے ایسے سخی امیدوار کو ووٹ دان کر دیتے ہیں۔اس فرشتہ صفت انسان کو ووٹ کیوں نہ دیں جس نے ہمارا لڑکا تھانے سے چھڑایا تھا اگرچہ پیسے ہمارے خرچ ہوئے تھے لیکن یہ تھوڑی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ تھانے گیا تھا۔اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ ان پڑھ ہے یا شارٹ کٹ سے امیر ہوا ہے۔اگر وہ کرپشن کرتا بھی ہے تو مجھے اس سے کیا اللہ سے پالے گا۔وہ الیکشن مہم کے دنوں میں محلے محلے تنور کھول دیتا ہے اور بکرے کا گوشت مہینوں ہمیں لذت یاب کرتا ہے۔ان دنوں میں ہم پانی کی جگہ کوک اور چنگ چی کی جگہ پجیرو میں جھولے بھی تو لیتے ہیں۔محلے کی نالی، گلی اور نلکا بھی تو اسی نیک طبیعت کے طفیل ہے۔ہمارے میٹرک فیل لڑکے کو نوکری اور ہمارے ملازمت سے برخاست انکل کو ٹھیکا بھی تو یہی پوتر انسان دلاتا ہے۔پھر ہم اس کے نعرے کیوں نہ لگائیں اور اسے ووٹ کیوں نہ دیں۔ملکی مسائل اور بین الاقوامی معاملات میں ہمیں ٹانگ اٹکانے کی کیا ضرورت۔ہمیں تو اپنے فرشتہ طبیعت حاجی صاحب سے غرض ہے بس وہ ایم پی اے منتخب ہو جائیں تو ستے خیراں............ یہ ہیں ہماری ترجیحات اور احتیاط جو ہم ووٹ دیتے وقت سامنے رکھتے ہیں۔تبھی گلریز جس نے اب امریکی الیکشن بھی دیکھ لیے ہیں مجھے اگلے دن پوچھ رہا تھا کیا ہمیں ووٹ دینا آتا ہے؟ میں

سوچ رہا ہوں ہم ووٹ دیتے نہیں بیچتے ہیں، اس کا مول لگاتے ہیں جو کبھی ذات برادری، محلّہ، رشتہ داری تو کبھی پیسا، نوکری، ٹھیکا، سائیکل، راشن یا پھر سلائی مشین ہوتی ہے۔ پھر اگر ہمارے یہ منتخب فرشتے ہمارا اور ملک کا مقدر بیچ دیں تو اچنبھا کیسا؟

ایک بین الاقوامی کانفرنس میں ماں بچے اور ان کی صحت کے حوالے سے مقالے پڑھے جا رہے تھے۔ امریکا کے ماہرین طب نے بڑے فخر سے بتایا کہ ہمارے ہاں ہر سو آدمیوں کے لیے ایک ڈاکٹر موجود ہے۔ یورپ میں یہ تناسب اس سے بھی بہتر صورت میں ہے جہاں ان کے ماہرین طب کے مطابق یو کے میں ہر سو آدمیوں کے لیے دو، فرانس میں تین اور جرمنی میں دو ڈاکٹر دستیاب ہیں۔ پاکستانی مندوب کی باری آئی تو اس نے کانفرنس کے سب شرکا کو یہ بتا کر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ میرے وطن میں ہر سو آدمیوں کے لیے سو ہی ڈاکٹروں کی سہولت موجود ہے۔ حیرت و استعجاب سے سب اس پاکستانی مندوب کا منھ تکنے لگے۔ پاکستانی ماہر طب نے انھیں حیران و پریشان دیکھ کر ایک لحہ توقف کیا اور پھر بولے۔ حضور والا! پاکستان میں ہر سو آدمیوں کے لیے سو ہی ڈاکٹر اس طرح دستیاب ہیں کہ ہمارا ہر فرد اپنے تئیں ڈاکٹر ہے، جس کا برملا اظہار وہ وقتاً فوقتاً ہر اس مریض کو ایک دو نسخے تجویز کر کے کرتا ہے جو بھی اس سے اپنی بیماری کا ذکر کرتا ہے۔ یہ ایسا ملک ہے جہاں ڈاکٹر بننے کے لیے ڈگری کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ ان کا یقین ہے کہ ''ڈگری ڈگری ہوتی ہے اصلی ہو یا نقلی''۔ اس کے ساتھ یا اس کے بغیر وہ ڈاکٹری سے لے کر جہازوں کو اڑانے تک کے تمام کام بلا خوف و خطر انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ آپ چنگ چی میں بیٹھے اپنے کسی روگ کا تذکرہ کریں، چنگ چی میں موجود تمام ڈاکٹر سواریاں باہمی مشاورت سے میڈیکل بورڈ فوراً تشکیل دے دیتی ہیں اور آپ کی منزل آنے سے پہلے دو تین نسخے آپ کو ہاتھ میں تھما کر رخصت کرتے ہیں۔ آپ کو سخت پیاس لگی ہے اور آپ سڑک کنارے شربت کے ٹھیلے پہ رک کر شکنجبین پینے لگتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے کسی مرض کا ذکر کر بیٹھتے ہیں، لیموں نچوڑتے ہوئے مسیحا صفت فرشتہ ترت آپ کے مرض کا مجرب نسخہ آپ کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ کشکول ہاتھ میں تھامے، چیتھڑوں میں ملبوس حق ہو، حق ہو کی صدا لگاتے ہوئے ایک فقیر آپ سے خیرات کا طلبگار ہوتا ہے اور آپ جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے بس اتنا کہتے ہیں کہ آج میرے دانت میں درد ہو رہا ہے، چٹاخ سے دو نسخے وہ گدائے مبذر آپ کے حوالے کر دے گا اور چھاتی ٹھونک کر یہ بھی کہ دے گا فائدہ نہ ہو تو مجھے چوک میں پھانسی دے دینا۔ انٹرنیشنل کانفرنس کے مندوبین یہ سب سن کر دیر تک تالیاں پیٹتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ یہ واضح نہ ہو سکا کہ یہ داد تھی یا کچھ اور۔ ہم نے تو سنا ہے کہ یورپ اور امریکا میں بغیر مستند ڈاکٹر کے نسخے کے میڈیکل اسٹور سے دوا تک نہیں مل سکتی۔ جبکہ ہمارے چھوٹے سے قصبے میں دس بارہ میڈیکل سٹور ہیں جن میں ہر وقت ڈاکٹر دھڑا دھڑ ٹیکے لگاتے ہوئے ڈاکٹری کرتے نظر آتے ہیں۔ پاکستان کے ہر گاؤں گوٹھ کی طرح میرے ہاں بھی ماشاءاللہ ایسے درجنوں ڈاکٹروں کی ریل پیل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گاؤں والے ہمارے PhD کرنے کے باوجود ہمیں اکثر پیار سے ماسٹر ہی کہتے ہیں اور ڈاکٹر کہنے سے ہچکچاتے ہیں۔ ٹیکے لگانے والے ان میٹرک پاس ڈاکٹروں

کی موجودگی میں ہماری ڈاکٹریٹ وہاں کوئی معنی نہیں رکھتی۔عوام الناس شرح صدر کے ساتھ میڈیکل Rep کو بھی ڈاکٹر صاحب کہہ کر پکارتے ہیں لیکن ان کے سامنے کوئی سکول کالج کا استاد یا پڑھا لکھا آدمی ہمیں ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرے تو وہ احتیاطاً اصلاح کر دیتے ہیں۔ کہ یہ ڈاکٹر نہیں ٹیچر ہیں۔کل شام سر بازار ایسا ہی واقعہ ہوا۔اثنائے سخن گلریز کی امریکا سے کال آ گئی۔میرا BP شوٹ کر رہا تھا۔چھوٹتے ہی اب کے میں نے اس سے کہا''نالائق مجھے بتاؤ کیا تمھارے امریکا میں اتنے ڈاکٹر ہیں جتنے ہمارے ہاں ہیں۔گلی گلی،نگر نگر،گوٹھ،گڑھی،ڈگر ڈگر''؟ وہ ہنسنے لگا۔ظاہر ہے اس آئینہ سی حقیقت کا اس کے پاس سوائے دانت نکالنے کے کیا جواب ہوسکتا تھا؟

ہم ہر کام میں اپنی مثال آپ ہیں۔دنیا میں کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔میرے کیا کہنے؟

☆......☆

اقوال زریں

(گلزار وڑائچ)

☆دوسروں کا مال بلا ضرورت خرچ نہ کرو۔

☆لوگوں کے درمیان صلح کراؤ۔

☆بدگمانی سے بچو۔

☆غیبت نہ کرو۔

☆جاسوسی نہ کرو۔

☆خیرات کیا کرو۔

☆غربا کو کھانا کھلایا کرو۔

☆ضرورت مندوں کو تلاش کر کے ان کی مدد کیا کرو۔

☆فضول خرچی نہ کیا کرو۔

☆خیرات کر کے جتلایا نہ کرو۔

☆مہمان کی عزت کیا کرو۔

☆نیکی پہلے خود کرو اور پھر دوسروں کو تلقین کرو۔

آس (افسانہ)

شرافت علی تاشف (لیکچرار اُردو)

میرے بڑے بچوں کی بھی شادیاں اس وقت ہوئیں جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ بڑا بیٹا ماشاءاللہ اپنی زندگی کی اکتالیس بہاریں دیکھ چکا تھا جب وہ اپنے گھر بار والا ہوا۔ کریمن بوا اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے بڑے غور سے اماں ہاجرہ کی باتوں کو سن کر حیران بھی ہو رہی تھی اور پریشان بھی۔

دسمبر کا مہینا تھا اور سال کا سب سے مختصر دن، ابھی عصر کی اذان ہوئے بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ ہوا کی خنکی نے تمام عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ شجرِ سایہ دار ابھی سے چپ سادھے بے حس و حرکت کھڑے گہری اور کالی رات کا انتظار کر رہے تھے۔ آنگن میں اُگے ہوئے پودوں اور خود رو گھاس پر اوس نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔

تو کیا سیرت کو اس طرح بٹھائے رکھو گی؟ کریمن بوا نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے اماں ہاجرہ سے استفسار کیا؟ ارے نہیں! میں کب ایسا کہہ رہی ہوں؟

اے سنو کریمن! پچھلی گلی میں نکڑ والے گھر تم نے بہت اچھا رشتہ کرایا تھا وہ اب تک تمھارے سر کو دعائیں دے رہے ہیں۔ تمھارا تو روز کا کام ہے رشتے اِدھر اُدھر کرانا، تم بات کرو نا، کسی سے کہو سنو، سیرت کے ابا تو یہی چاہتے ہیں کہ ابھی ایک آدھ سال رہنے دیں مگر میں ایسا نہیں سوچتی۔ اچھا، چلو ٹھیک ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی بوسیدہ سی ڈائری نہ جانے کہاں سے نکالی اور اس میں اماں ہاجرہ کا نام لکھ لیا۔

کچھ دن بعد کریمن بوا نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر بے سود۔ اماں ہاجرہ کی آواز آئی۔ اے دیکھو تو کون ہے؟ کب سے کھٹ کھٹ ہو رہی ہے۔ سب ملازم اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ چار و ناچار سیرت کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی اور سیدھی دروازے پر جا پہنچی۔ کریمن بوا کو دیکھ کر اپنے دوپٹے کے آنچل کو اس ادا سے سر پر اوڑھ لیا جیسے کوئی تتلی اڑتی ہوئی ہولے سے لالے کے پھول پر بیٹھ گئی ہو، جیسے نخلستان میں اچانک صبا کا جھونکا ہر چیز کے انگ انگ میں زندگی کی نئی کرن روشن کر جائے۔ ارے کیا اندر بھی آنے دو گی یا اس طرح میرا منہ چڑھاتی رہو گی؟ ہٹ لڑکی! کریمن بوا سیرت کو ایک طرف ہٹا کر دھڑلے سے اندر آ گئی اور بلا سوچے سمجھے گھر بھر میں گونجنے لگی۔

اماں ہاجرہ ایک رشتہ ہے اگر تمہیں پسند ہو؟ لڑکا ماشاءاللہ بہت خوب صورت اور پڑھا لکھا ہے۔ اماں ہاجرہ نے کریمن

بوا کی بات کاٹتے ہوئے کہا! پڑھائی میں کیا ہماری سیرت کم ہے؟ ماشاءاللہ ایم فل کیے ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ اچھا میں بات کر رہی تھی کہ لڑکا شہر میں ایک فرم میں کام کرتا ہے۔ اچھی تنخواہ ہے۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ یہ دیکھو میں اس کی تصویر لے کر آئی ہوں۔ کریمن بوا نے تصویر نکال کر اماں ہاجرہ کے سامنے رکھ دی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

لڑکا تو اچھا ہے مگر عمر میں زیادہ لگ رہا ہے۔ ارے کہاں؟ آج کل لڑکے پڑھائی کے چکروں میں الجھ کر اپنی عمر سے زیادہ بوڑھے لگتے ہیں۔ تم جا کر ملو گی نا تو خود یقین آ جائے گا۔ اماں ہاجرہ رشتہ سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھی۔ کریمن بوا کو اس نے خرچہ پانی دے کر چلتا کیا اور یہ نصیحت کی کہ اگلی دفعہ جب آنا تو اس سے بہتر رشتہ لانا۔

سال، ماہ، دن، گھنٹے اور سیکنڈ گزرتے رہے لیکن اسے کوئی ان کے شایان شان رشتہ نہ ملا۔ ہر دفعہ ہاجرہ کوئی عذر بنا کر انکار کر دیتی اور سیرت کے ابو تو ہزار میم میخ نکالتے تھے۔

سیرت کا گھرانہ اچھا خاصہ کھاتا پیتا تھا۔ زر اور زمین کی ریل پیل تھی، گھر میں سہولت کی ہر چیز میسر تھی۔ بڑے میاں صبح کو زمینوں کی دیکھ بھال اور اپنے فارم ہاؤس پر نکل جاتے اور گہرے دھند لکے میں واپس آتے۔ اماں ہاجرہ سارا دن گھر کے جملہ معاملات کو دیکھتی۔ کبھی اس نوکر کو ڈانٹ رہی ہیں کبھی اسے سمجھا رہی ہیں۔ مالی کو پودوں کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر رہی ہے تو کبھی سودا سلف لانے والے سے پیسوں کا حساب کتاب کیا جا رہا ہے۔ اسی میں سارا دن گزر جاتا تھا۔

سیرت اب اپنی عمر کا چالیسواں سال دیکھ رہی تھی۔ سارا دن گھر میں چپ چاپ اپنی سوچوں میں گم پورے گھر میں گھوما کرتی تھی۔ کبھی نوکرانیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کیا جا رہا ہے تو کبھی ان کی شادیوں کے قصے سنے جا رہے ہیں۔ وہ ان قصوں کو سن کر رات کے وقت لحاف میں پڑی سوچتی رہتی تھی کہ کتنی خوش قسمت ہیں یہ عورتیں، شوہر ہیں، بچے ہیں، اپنے گھروں میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہیں۔ کاش؟؟؟؟؟

خاص طور پر جب بھی اس کی کسی سہیلی کی شادی ہوتی تو بڑے اشتیاق سے ان کے گھر جاتی، تمام حالات و واقعات کا جائزہ لیتی اور اُن سے ''ہر بات'' پوچھتی، شام کو جب کہرا اپنے پر پھیلانے شروع کر دیتا پھر واپس آتی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ لحاف میں دبک کر بیٹھ جاتی اور کافی دیر سوچوں کی وادی میں گم سی رہتی۔ اسی اثنا میں آدھی رات گزر جاتی۔ وہ بار بار صبح کی دہرائی ہوئی باتوں کو یاد کرتی اور پھر اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑتی جو کانپ رہے ہوتے بس پھر کیا تھا؟؟

اس کے ہاتھ جواب دے جاتے، وہ اپنا حق مانگنے لگتی۔ رات کے پچھلے پہر کوئی ایسا نہیں ہوتا تھا جو اس کی تشفی کر سکتا۔ پھر اس کا ہاتھ تیزی سے چلنے لگتا اور کچھ ساعتیں گزارنے کے بعد وہ پرسکون ہو جاتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے پچھلی تمام راتوں کا سکون اس رات میں پنہاں ہے۔

دن چڑھ جاتا لیکن سیرت اٹھنے کا نام نہ لیتی۔ اٹھ کر کرنا بھی کیا ہوتا تھا۔ بیدار ہونے کے ساتھ ہی اس کی چائے

کمرے میں رکھ دی جاتی۔ آج جب وہ بیدار ہوئی تو کافی مطمئن تھی۔ جنوری کی آخری صبح تھی اور باہر درخت اور پودے تمام رات جاری رہنے والی بارش کے بعد نکھرے اور ستھرے نظر آ رہے تھے۔ اس نے اگر چہ شال اوڑھ رکھی تھی لیکن شال کے اندر سے بھی سردی کی ہلکی سی لہر اسے بے چین کر رہی تھی۔ کمرے سے باہر آئی تو سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی جا رہی تھی۔ کبھی سورج بادلوں پر غلبہ ڈال لیتا تو کبھی اودھے اودھے بادل مل کر سورج کو گھیرا ڈال لیتے تھے۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا اب تک چل رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ مغرب کی طرف اٹھ گئی۔ دیکھا تو قوس قزح آسمان پر براجمان تھی۔ بنیادی رنگ نمایاں نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد قوس قزح آسمان سے غائب ہو گئی اور وہ نہانے کی غرض سے کمرے میں چلی گئی۔

گھر میں سیرت کی ذمہ داری بس کھانا پکانے کی ہوتی تھی۔ سبزی بنانا اور برتن دھونے کا کام نوکرانیوں کے ذمے تھا۔ کیوں کہ اس کی اماں کا کہنا تھا کہ کھانا اپنے ہاتھوں سے بنا ہوا ہی اچھا لگتا ہے۔ سیرت کا بڑا بھائی اب پچاسویں میں تھا۔ اپنے ابا میاں کے ساتھ تمام دن کھیتوں کی دیکھ بھال اور نوکروں کو ان کی ڈیوٹیاں بانٹ کر دیا کرتا۔

ابا میاں گھر آئے تو اماں ہاجرہ ان کے بہت قریب ہو کر بیٹھ گئیں۔ ایسے جیسے بہت ہی راز و نیاز کی بات کہنی ہو۔ ابا میاں چونکے اور مسکرا کر کہا! بیگم ایسے لگ رہا ہے جیسے چغل خور کی طرح تم میرا جسم چیک کر دیکھنے لگی ہو کہ کہیں میں............

نہیں سرتاج ایسی بات نہیں ہے میں تو بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ سیرت کی عمر نکلتی جا رہی ہے اور مجھے اس کی بہت فکر لاحق رہتی ہے۔ اتنے میں دو موٹے موٹے آنسو چھلک کر اس کی گود میں گر پڑے۔ ابا میاں جو بالکل سہمے ہوئے بیٹھے، توجہ کسی اور طرف منہ میں چھالیہ دبائے سامنے والی دیوار میں لگے کیل کو دیکھ رہے تھے جو پچھلے کئی سالوں سے اسی طرح دیوار میں پیوست تھا، فوراً محتاط اور بولے! تو دیکھو نہ کہیں رشتہ، دیکھتی کیوں نہیں ہو؟ آخر جہاں بھی جائے گی دس پندرہ ایکڑ تو ساتھ لے کر جائے گی اور ہمیں اچھا خاصا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

اپنے شوہر کی باتیں سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اُس کا شوہر ایسی باتیں بھی سوچتا ہے۔ خیر ضبط کر گئی اور بولیں! تو کیا بیٹی کو اسی طرح بٹھائے رکھو گے؟ سنو ہاجرہ بیگم جب کوئی اچھا رشتہ ملے گا تو کر دیں گے شادی اور آج آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ مجھ سے اس موضوع پر دوبارہ بات کبھی نہ کرنا۔ اماں ہاجرہ اس تحکمانہ لہجے پہ اپنا سا منہ لے کے رہ گئی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ایسے اٹھی جیسے کوئی زندگی ہار گیا ہو۔ اس ساٹھ سالہ شخص سے مجھے اس رویے کی اُمید نہیں تھی۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں سوتے ہوئے گزرتا تھا۔ باہر بھی وہ کم ہی آتی جاتی تھی۔ شادی کی تقریبات میں شرکت کرنا بھی وہ بھول گئی تھی۔ بس اِکا دُکا سہیلیاں تھیں جو اس سے کبھی کبھار ملنے آ جایا کرتی تھیں۔ آج اس کی دوست نگہت ملنے آئی تو دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئی۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے، سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو۔ سیرت نے نظریں نیچے کرتے ہوئے کہا بس پتا نہیں مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔

کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا۔ بہت کوشش کرتی ہوں کہ اردگرد کے ماحول سے لطف اندوز ہوسکوں مگر نہ جانے ایک انجانا سا خوف میرے دل میں بیٹھا چلا جاتا ہے۔ وہ خوف کس کا ہے اور کیوں ہے؟ یہ میں نہیں جانتی، تم اپنا چیک اپ کراؤ۔ شہر میں بہت اچھے ڈاکٹر ہیں بل کہ میری ایک جاننے والی سہیلی ڈاکٹر ہے۔ میں تمہیں اس کا نمبر دیتی ہوں اس کے پاس چلی جانا۔ اس نے نمبر لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بعد دونوں آپس میں کئی موضوعات پر گفت وشنید کرتی رہیں۔

گرمیوں کے دن تھے اور بھادوں کا موسم۔ آسمان پر کالے بادلوں نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ نمی والی ہوا مسلسل چل رہی تھی لیکن گھٹن بہت زیادہ تھی۔ اماں ہاجرہ نے آسمان پر نگاہ ڈالی تو اسے بادلوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ سوچنے لگی کافی دن ہو گئے ہیں کریمن بوا تو جیسے گھر کا رستہ ہی بھول گئی ہو۔ کافی دفعہ فون بھی کیا مگر جواب ندارد۔ اب تو اماں کی پریشانی دو چند ہو گئی تھی کیوں کہ نگہت جاتے ہوئے یہ کہہ گئی تھی کہ اسے ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جایئے گا۔

آخر ایک دن جی کڑا کر کے وہ سیرت کو لے کر شہر چلی گئی۔ تھکی ماندی سیرت نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ بہت تگ و دو کے بعد انھیں ڈاکٹر کا کلینک مل ہی گیا۔ رش بہت زیادہ تھا۔ دونوں ماں بیٹی کو گھنٹہ بھر انتظار کرنے کے بعد پرچی والے کاؤنٹر تک رسائی ہوئی۔ ایک شوخ اور چنچل سی لڑکی کاؤنٹر پر براجمان تھی۔ بڑی تیزی کے ساتھ اس کا ایک ہاتھ پرچی پر نمبر لکھتا اور فوراً ہی دوسرے ہاتھ سے پیسے کاؤنٹر کے اندر رکھ دیتی تھی۔ ایک ہزار روپے نکالیں اماں جی! بیٹا ڈاکٹر کی فیس تو چیک اپ کے بعد ادا کی جاتی ہے تو یہ پہلے کیوں؟

اماں جی میرے پاس زیادہ بحث ومباحثے کا وقت نہیں ہے۔ ہزار روپے دیں نہیں تو یہ پچھلی باجی کو آگے آنے دیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اماں نے ہزار روپے نکال کر لڑکی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

ڈاکٹر: جی بتائیں کیا مسئلہ ہے آپ کا؟

ہاجرہ: میری بیٹی ہر آئے دن کے ساتھ کمزور ہوتی جا رہی ہے نہ جانے اسے کیا روگ لگ گیا ہے؟

ڈاکٹر: اچھا یہ آپ کی بیٹی ہے؟ کتنے بچے ہیں آپ کے؟

سیر :ت جی میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر اس کا منہ لٹک گیا۔

ڈاکٹر: اچھا میں یہ کچھ ٹیسٹ لکھ کر دے رہی ہوں۔ یہ ساتھ ہی لیبارٹری ہے ٹیسٹ ادھر سے کرا لیجیے۔ اگلی دفعہ جب آپ آئیں گی تو رپورٹس مل جائیں گی آپ کو۔

سورج چاند طلوع اور غروب ہوتے رہے۔ بہاریں اپنا رنگ جماتی رہیں اور خزاں درختوں کو پتوں سے خالی کرتی رہی۔ میلے ٹھیلے بھی آتے اور گزر جاتے۔ عرس کی تقریبات بھی بلاناغہ ہر سال منعقد کی جاتیں۔ اپریل اور جون کے مہینوں میں

آم کے درختوں پر پھول آتے اور جھڑتے رہے، ساون کے مہینے میں برساتیں اپنا رنگ جما کر چلی جاتیں اور پھر جاڑے کی رُت میں ہرے کچور سنگترے کے درختوں پر دسمبر کی دھوپ پڑتی تو چمک اٹھتے۔ ان تمام کیفیات کا مجموعہ بھی اُسے خوش رکھنے میں ناکام ثابت ہوتا تھا۔

جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئیں تو نوکرانی نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اماں ہاجرہ کے کان میں ایسی بات کہی جس سے اماں کا رنگ فق ہو گیا۔ سیرت پر اس کیفیت کا کچھ زیادہ اثر نہ ہوا، وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور جاتے ہی پلنگ پر اوندھی لیٹ کر خواب خرگوش کے مزے لینے لگی۔

شام کا وقت تھا، پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اس کی آنکھ کھلی تو صحن میں اماں ہاجرہ اور نوکرانی کی گفت گو وہ صاف سن سکتی تھی۔ نوکرانی تفصیل سے بتاتے ہوئے بولی کہ بڑی اماں جو پچھواڑے مکان میں رہتی ہیں کہہ رہی تھیں کہ لڑکی کافی بڑی ہو گئی ہے۔ اماں ہاجرہ کو چاہیے کہ اسے رخصت کر دیں۔ اس نے کہا کہ بیٹی اماں ہاجرہ کی ہے اور فکر آپ کو کیوں لاحق ہے؟

بس یہ کہنا تھا کہ بڑی بی ناراض ہو کر چل دی اور پانی تک نہیں پیا۔ آج ایک نوکرانی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑ رہا تھا لیکن اس کے سوا چارہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔ منھ ایک طرف کر کے آنچل کے پلو سے نیم گرم قطرے گرتے ہوئے صاف کرنے لگی۔

اس کی رپورٹس تیار تھیں اور آج انھوں نے شہر جانا تھا۔ رپورٹس لے کر وہ ڈاکٹر کے پاس گئیں۔ ڈاکٹر نے رپورٹ چیک کرنے کی فیس جمع کرانے کا کہا اور ساتھ ہی رپورٹس والا بڑا لفافہ اس سے لے کر رکھ لیا۔ جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر کے دونوں ہاتھوں سے رپورٹس نیچے گر پڑیں۔ کیا ہوا ڈاکٹر! اماں ہاجرہ نے استفسار کیا۔

کچھ نہیں بس وہ اچانک گر پڑیں تھیں۔ ڈاکٹر نے تسلی دی کہ آپ کی بیٹی کا علاج ممکن ہے اور کل ہی آپ ہمارے ہسپتال آ جائیں اور بیٹی کو داخل کرا دیں۔ مگر ہوا کیا ہے میری بیٹی کو؟ کچھ خاص نہیں بس آپ صبح آ جایئے گا، علاج شروع کر دیں گے۔

اتنے میں ڈاکٹر نے نرس کو بلایا اور ان کا نام پتا لکھنے کو کہا۔ دونوں باہر چلی گئیں تو ڈاکٹر اور نرس آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ آخر اس لڑکی کا مسئلہ کیا ہے؟ نرس نے استفسار کیا؟ پگلی تمھیں نہیں پتا یہ دیکھو! رپورٹس دیکھو کچھ دن کے لیے اللہ نے ہماری روزی کا وسیلہ بنایا ہے۔

بس تم دیکھتی جاؤ۔ چھوڑو ان باتوں کو چلو اپنا کام کرو۔ اگلے دن دونوں ماں بیٹی ہسپتال میں تھیں۔ کچھ دن تک سیرت بستر مرگ پر پڑی رہی اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جو ہر کسی پر ایک دن ضرور آتا ہے۔ ڈاکٹر نے بڑے رازدارانہ انداز سے نرس کو

اپنے کمرے میں بلایا اور کہا! لڑکی کے پاس وقت بہت کم ہے۔ بریسٹ کینسر کا زہر پورے جسم میں بُری طرح سرایت کر چکا ہے۔

اماں جی آپ ایسا کیجیے کہ اب آپ کی بیٹی بالکل تن درست ہے اسے گھر لے جایئے۔ جب انسان کا آخری وقت قریب آتا ہے تو بڑی سے بڑی بیماری بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ ہسپتال کے باہر اس کے ابو اور بھائی انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اور نرس بھی انھیں رحم زدہ نظروں سے آخری مرتبہ دیکھ رہی تھیں۔ اماں ہاجرہ کی چھٹی حس نے اسے سب کچھ بتا بھی دیا تھا اور سمجھا بھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ڈاکٹر سے کوئی سوال نہیں کیا۔

ہسپتال سے آئے ہوئے آج دوسرا دن تھا۔ صبح ہی سے اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ نوکر چاکر اردگرد بیٹھے تھے۔ اتنی دیر میں گھر کا دروازہ کھلا اور کریمن بوا ایک عرصہ بعد نازل ہوئیں۔ دور ہی سے بلند آواز میں کہنے لگی اماں ہاجرہ آج ایسا رشتہ لے کر آئی ہوں کہ آپ کو چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑے گا۔ سیرت نے اپنے سر کو جنبش دی اور کریمن بوا کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

☆......☆
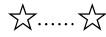
حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ

انتخا : بدرزاق (سال چہارم)

1- گناہ تمہیں اتنا نقصان نہیں پہنچا تا جتنا مسلمان بھائی کو ذلیل اور بے عزت کرنا۔
2- درویشی وہ ہے جو جو کسی کو محروم نہ کرے۔
3- عارف وہ ہے جو اپنا دل دونوں جہان سے ہٹالے۔
4- عاشق خدا وہ ہے جو ابتدائے عشق میں ہی فنا ہو جائے۔
5- بدترین شخص وہ ہے جو توبہ کی اُمید پر گناہ کرے۔
6- مومن وہ شخص ہے جو تین چیزوں کو دوست رکھے موت، فاقہ اور درویشی۔
7- خود پسندی کبیرہ گناہ ہے۔
8- وہ ضعیف ترین ہے جو اپنی بات پر قائم کرے۔
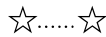
پیغام کیا ہے؟

گلفام ناظر
اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی

فیس ماسک لگاتا تو ایک بہانہ ہے اصل میں پوری دنیا خدا کو منہ دکھانے کے لائق نہیں ہے۔

اگر چہ کرونا وائرس ایک مہلک وبا اور جان لیوا ثابت ہو چکی ہے۔اس نے دسمبر 2019ء کو چین کے صوبہ ووہان سے جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جہاں تک اس وباء کے بارے میں لوگوں کی رائے اور نقطہ نظر وہ انتہائی افسردہ اور مایوس کن ہے۔مگر اس کا حقیقی چہرہ ابھی تک شاید کسی نے نہیں دیکھا یا پرکھا۔لہٰذا آج یہ کوشش کرتے ہیں۔ میں آج کرونا وائرس کا حقیقی پیغام اور اصلیت آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔اگر چہ یہ وائرس وبا کی صورت میں ظاہر ہوا مگر ایک پیغام بھی اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ''پیغام کیا ہے؟''

کرونا وائرس بار بار اور واضح الفاظ میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ:

1- نماز تو تم ادا کرتے ہو مگر دل سے کرونا۔
2- تم دوسروں کی مدد تو کرتے ہو مگر بغیر دکھاوے اور سیلفی کے کرونا۔
3- تم روزے تو رکھتے ہو مگر نیت کو بھی صاف کرونا۔
4- تمہیں اگلے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے مگر اپنے شہتیر کی طرف نگاہ کرونا۔
5- تم کو بڑی گاری، بنگلے اور مکان کی فکر ہے مگر ابدی زندگی کی بھی فکر کرونا۔
6- تم کو دوسروں کی ماں، بہن، بیٹی نظر آتی ہے کبھی اپنی پر بھی نظر کرونا۔
7- تمہیں بنک بیلنس اور پیسہ تو نظر آتا ہے مگر اپنی قبر پر بھی نظر کرونا۔
8- مستقبل کی پلاننگ تو تم بہت اچھی کرتے ہو کبھی اس میں موت کے دن کا بھی ذکر کرونا۔
9- تم نے بڑی بڑی ڈگری تو حاصل کر لی ہے مگر اخلاقیات کی ڈگری بھی حاصل کرونا۔
10- حقوق اللہ کا بہت خیال کرتے ہو کبھی حقوق العباد کا بھی خیال کرونا۔
11- فریب تو بہت دوسروں کو دیتے ہو مگر خدا کے عذاب پر بھی نگاہ کرونا۔

12- رشوت (چائے پانی) کا بہت ذکر کرتے ہو کبھی اس کے انجام پر بھی دھیان کرونا۔

13- جھوٹی گواہی دینے میں تو بہت ماہر ہو۔ اس کی سزا پر بھی غور کرونا۔

14- کتاب (کلامِ خدا) کا نام صرف یاد ہے کبھی اس کی اندرونی داستان پر غور کرونا۔

15- دعوے تو بہت کرتے ہو یہ میرا ہے وہ میرا ہے کبھی کفن کے ساتھ جیب نہ ہونے کا قانون بھی یاد کرونا۔

16- اس دنیا میں تو آیا خالی ہاتھ اور جائے گا بھی خالی ہاتھ کبھی اس کو اپنی زندگی کا محور بھی کرونا۔

17- کرپشن، ملاوٹ، دھوکہ، فریب نہ جانے کیا کیا تم کرتے ہو۔ اس بابت قبر میں پڑے لوگوں سے بھی کبھی پوچھا کرونا۔

18- تمہاری نگاہ میں تو دوسرے کافر ہیں کبھی اپنے گریبان میں نظر کرونا۔

19- باتوں باتوں میں تو تم نبیوں سے بھی آگے چلے جاتے ہو مگر کبھی ان پر عمل بھی کرونا۔

20- دنیا کے قوانین میں تو بادشاہ بن بیٹھے ہو مگر خدا کے احکام/قوانین میں بھی بادشاہی کرونا۔

21- خود تو تم دو روٹی سے زیادہ نہیں کھا سکتے لہٰذا کسی بھوکے پر بھی نظر کرونا۔

22- دولت کے نشے نے تجھے تیری اوقات سے باہر کیا کبھی کسی کی عزت کر کے بھی دیکھا کرونا۔

23- جنازہ تو روزانہ تم دیکھتے ہو لحہ بہ لحہ کبھی اس کی پیروی بھی کرونا۔

24- مٹی سے بنے ہو تم تکبر کس بات کا لہٰذا اپنی اوقات پر رحم کرونا۔

25- جو مرضی کرو تم مگر قبر زور زور سے پکار رہی ہے میری بات پر توجہ کرونا۔

26- تیری اوقات/اصلیت ایک بلبلے سے بھی کم ہے اب اس بات پر بھی شرم کرونا۔

اس بات کا اندازہ آج انسانی زندگی اور اس کا محور ہے۔ آج انسان جس غفلت کے انبار میں اپنی اوقات اور اصلیت کو کھو بیٹھا ہے کرونا وائرس نے اس کا اعلان اور واضح بیان دے کر مجھے اور آپ کو حقیقت سے آشنا کروا دیا ہے۔ افسوس اب بھی نہ سمجھیں تو پھر کبھی نہیں۔

☆......☆

☆ کسی پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔

☆ نفاق سے بچو۔

☆ کائنات کی تخلیق اور عجائب کے بارے میں غور و فکر کرو۔

''تاریخ اپنا آپ دہراتی ہے کیوں؟''

تحقیقی مقالہ: یوحنا جان

عام طور پر انسان کے لیے وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ کرتا ہے یا کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ کرنے کا انداز کئی طریقوں اور کئی طرح سے ہوتا ہے۔ وہ اندازِ گفتگو، اندازِ بیان، دیکھنے، سننے اور عملی مظاہرہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر ان کا تعلق انسان کے اندرونی خیالات، جذبات اور احساسات سے ہوتا ہے جو وہ ان ذرائع کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ چاہے وہ داخلیت اور خارجیت دونوں لحاظ سے ہی کیوں نہ ہو۔

آج کا انسان اور دور دونوں بے سکونی، بے چینی، ہٹ دھرمی اور نفسانفسی اور دیگر علامات سے بھرا ہوا ہے۔ آج کا انسان ظاہری طور پر کچھ اور ہے اور باطنی طور پر کچھ اور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نفرت، بے ایمانی، بے راہروی اور نا اتفاقی اور احساس کمتری کا نزول ہو چکا ہے۔ کیونکہ انسان کے لیے وہی ہوتا ہے جو وہ اپنی نیت اور سوچ و فکر کا محور بناتا ہے۔

تاریخ مسلسل اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے جو بیج بویا جائے گا وہی کاٹا جائے گا۔ مثال کے طور پر
اگر کھیت میں گندم کا دانہ بویا گیا تو اس کی جگہ گندم ہی کاٹی جائے گی یہ نہیں کہ کوئی اور۔

بالکل اسی طرح جب تاریخ میں ہو بہو عناصر رونما ہوتے ہیں تو تاریخ بھی اپنا آپ دہراتی ہے کیونکہ اس کا تعلق اس کے باطنی ارادوں اور افکار سے ہوتا ہے۔ تاریخ کے اوراق کو اٹھائیں تو ملک مصر، فرعون کا زمانہ اور خدا کا حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل قوم کے ہاں بھیجنا ایک بہترین تاریخ کا عمل اور مظاہرہ ہے۔ پھر اس قوم پر دس قسم کی آفتیں نازل ہوئیں جو کہ واضح کرتا جاتا ہوں۔ جب پاک کلام کا مطالعہ کریں تو

بائبل مقدس کے پرانا عہد نامہ میں خروج کی کتاب اس کا باب 06 سے باب 11 تک اس کی تفصیل ملتی ہے۔
پھر بالکل اسی طرح قرآن پاک سورۃ بنی اسرائیل میں اس کا تذکرہ ہو بہو ملتا ہے۔
کلام اقدس میں ہمیں دس قسم کی وباؤں کا ذکر بڑے ہی عمدہ انداز میں ملتا ہے جو کہ ذیل میں ہیں۔

(i) پانی کا خون میں تبدیل ہونا (ii) مینڈکوں کی برسات۔
(iii) مچھروں کی وبا (iv) مکھیوں کی وبا
(v) مری (vi) اولے

(vii) ٹڈیوں کی برسات (viii) پھوڑے
(ix) تاریکی (x) دیگر آفتوں کی دھمکیاں

اگر آج کے دور میں خاص کر پاکستان کی بات کریں تو ان آفتوں کی روشنی میں ان کا پس منظر واضح اور نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ

برائی عروج پر تھی، کلام خدا سے دوری، برائی کا دن بدن زیادہ ہونا، جھوٹ اور فریب، دھوکہ، دونمبری کا استعمال، جھوٹی قسمیں، ملاوٹ اور دیگر لاتعداد برائیاں۔ تب یہ آفتیں نازل ہوئیں جن کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ اب غور کریں اپنے معاشرے پر (پاکستان) کے حالات واقعات پر۔

یہاں پر زنا آسان اور شادی مشکل، جھوٹ کی حمایت اور سچ کی مخالفت، خدا کو راضی رکھنے کی بجائے لوگوں کی رضامندی اور دیگر منفی سرگرمیاں۔

مندرجہ بالا دس آفتوں میں سے پاکستان میں اس وقت سات آفتیں پوری ہو چکی ہیں۔ جو کہ ذیل ہیں:

(i) پانی کا خون میں تبدیل ہونا (آج پاکستان کی سرزمین میں پانی کی کمی واقع ہے)
(ii) مچھروں کی وبا (پاکستان میں ڈینگی وبا کا آنا)
(iii) مری (پاکستان میں کرونا اور دیگر طرح سے اموات)
(iv) اولے (جون 2020ء میں تیار فصل تباہ اور موجودہ بارشوں سے بھی ستمبر 2020)
(v) ٹڈی دَل (پاکستان میں جون 2020ء تک تقریباً 60 اضلاع میں ٹڈیوں کا حملہ)
(vi) تاریکی (زیادہ تر جسمانی لحاظ سے آج زندہ ہیں مگر روحانی لحاظ سے مردہ ہے)
(vii) دیگر آفتوں (پاکستان میں 8 اکتوبر 2005 زلزلہ، آٹے کی قلت، چینی کی قلت، پٹرول کی قلت، ایمان کی قلت، تربیت کی قلت، انسانیت کی قلت وغیرہ)

اس لحاظ سے واضح ہوا کہ جو بیج بویا جائے گا وہی کاٹا جائے گا۔ لہٰذا بات سوچنے اور عمل کرنے کی ہے تاریخ ہمیشہ اپنا آپ کیوں دہراتی ہے؟
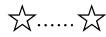
انکل ابراہیم

محسن رضا

(اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی)

یہ تقریباً 1957ء کی بات ہے کہ فرانس میں کہیں ایک رہائشی عمارت کی نکڑ میں ترکی کے ایک پچاس سالہ بوڑھے آدمی نے چھوٹی سی دکان بنا رکھی تھی۔ اردگرد کے لوگ اس بوڑھے کو ''انکل ابراہیم'' کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے۔ انکل ابراہیم کی دکان میں چھوٹی موٹی گھریلو ضروریات کی اشیاء کے علاوہ بچوں کے لیے چاکلیٹ، آئسکریم اور گولیاں، ٹافیاں دستیاب تھیں۔

اسی عمارت کی ایک منزل پر ایک یہودی خاندان آباد تھا جن کا ایک سات سالہ بچہ ''جاد'' تھا۔

جاد تقریباً روزانہ ہی انکل ابراہیم کی دکان پر گھر کی چھوٹی موٹی ضروریات خریدنے کے لیے آتا تھا۔ دکان سے جاتے ہوئے انکل ابراہیم کو کسی اور کام میں مشغول پا کر جاد نے کبھی بھی ایک چاکلیٹ چوری کرنا نہ بھولی تھی، ایک بار جاد دکان سے جاتے ہوئے چاکلیٹ چوری کرنا بھول گیا۔ انکل ابراہیم نے جاد کو پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہا،

''جاد......! آج چاکلیٹ نہیں اٹھاؤ گے کیا......؟''

انکل ابراہیم نے یہ بات محبت میں کی تھی یا دوستی سے مگر جاد کے لیے ایک صدمے سے بڑھ کر تھی۔ جاد آج تک یہی سمجھتا تھا کہ اس کی چوری ایک راز تھی مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔

جاد نے گڑگڑاتے ہوئے انکل ابراہیم سے کہا،

''آپ اگر مجھے معاف کر دیں، تو آئندہ وہ کبھی بھی چوری نہیں کروں گا۔''

مگر انکل ابراہیم نے جاد سے کہا،

''اگر تم وعدہ کرو کہ اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی کی چوری نہیں کرو گے تو روزانہ کا ایک چاکلیٹ میری طرف سے تمہارا ہوا، ہر بار دکان سے جاتے ہوئے لے جایا کرنا۔''

اور بالآخر اسی بات پر جاد اور انکل کا اتفاق ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا اور اس یہودی بچے جاد اور انکل ابراہیم کی محبت گہری سے گہری ہوتی چلی گئی۔ بلکہ ایسا ہو گیا کہ انکل ابراہیم ہی جاد کے لیے باپ، ماں اور دوست کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ جاد کو جب کبھی کسی مسئلے کا سامنا ہوتا یا پریشانی ہوتی تو

انکل ابراہیم سے ہی کہتا، ایسے میں انکل میز کی دراز سے ایک کتاب نکالتے اور جاد سے کہتے کہ کتاب کو کہیں سے بھی کھول کر دو۔ جاد کتاب کھولتا اور انکل وہیں سے دو صفحے پڑھتے، جاد کو مسئلے کا حل بتاتے، جاد کا دل اطمینان پاتا اور وہ گھر کو چلا جاتا۔

اور اسی طرح ایک کے بعد ایک کرتے سترہ سال گزر گئے۔

!......سترہ سال کے بعد جب جاد چوبیس سال کا ایک نوجوان بنا تو انکل ابراہیم بھی اس حساب سے سڑسٹھ(67) سال کے ہو چکے تھے۔ داعی اجل کا بلاوا آیا اور انکل ابراہیم وفات پا گئے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے پاس جاد کے لیے ایک صندوقچی چھوڑی تھی، اُن کی وصیت تھی کہ:

''اس کے مرنے کے بعد یہ صندوقچی اس یہودی نوجوان جاد کو تحفہ میں دے دی جائے۔''

جاد کو جب انکل کے بیٹوں نے صندوقچی دی اور اپنے والد کے مرنے کا بتایا تو جاد بہت غمگیں ہوا۔ کیونکہ انکل ہی تو اس کے غمگسار اور مونس تھے۔ جاد نے صندوقچی کھول کر دیکھی تو اندر وہی کتاب تھی جسے کھول کر وہ انکل کو دیا کرتا تھا۔

جاد انکل کی نشانی گھر میں رکھ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ مگر ایک دن اُسے کسی پریشانی نے آ گھیرا۔

آج انکل ہوتے تو وہ اسے کتاب کھول کر دو صفحے پڑھتے اور مسئلے کا حل سامنے آ جاتا۔ جاد کے ذہن میں انکل کا خیال آیا اور اس کے آنسو نکل آئے۔

''کیوں ناں آج میں خود کوشش کروں۔''

کتاب کھولتے ہوئے وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوا، لیکن کتاب کی زبان اور لکھائی اُس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ کتاب اُٹھا کر اپنے تیونسی عرب دوست کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ ''مجھے اس میں سے دو صفحے پڑھ کر سناؤ۔''

مطلب پوچھا اور اپنے مسئلے کا اپنے تئیں حل نکالا۔ واپس جانے سے پہلے اُس نے اپنے دوست سے پوچھا،

''یہ کیسی کتاب ہے............؟''

تیونسی نے کہا۔

''یہ ہم مسلمانوں کی کتاب ''قرآن'' ہے۔''

جاد نے پوچھا،

''مسلمان کیسے بنتے ہیں......؟''

تیونسی نے کہا،

کلمہ شہادت پڑھتے ہیں اور پھر شریعت پر عمل کرتے ہیں۔

جاد نے کہا،

تو پھر سن لو میں کہہ رہا ہوں اَشۡھَدُ اَنۡ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّد رسول الله

جاد مسلمان ہو گیا اور اپنے لیے ''جاد اللہ القرآنی'' کا نام پسند کیا۔ نام کا اختیار اس کی قرآن سے والہانہ محبت کا کھلا ثبوت تھا۔ جاد اللہ نے قران کی تعلیم حاصل کی، دین کو سمجھا اور اس کی تبلیغ شروع کی۔

یورپ میں اس کے ہاتھ پر چھ ہزار سے زیادہ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ایک دن پرانے کاغذات دیکھتے ہوئے جاد اللہ کو انکل ابراہیم کے دیے ہوئے قرآن میں دنیا کا ایک نقشہ نظر آیا جس میں براعظم افریقہ کے ارد گرد لکیر کھینچی ہوئی تھی اور انکل کے دستخط کیے ہوئے تھے۔ ساتھ میں انکل کے ہاتھ سے ہی یہ آیت کریمہ لکھی ہوئی تھی۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمة و الموعظة الحسنة

''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔''

جاد اللہ کو ایسا لگا جیسے یہ انکل کی اس کے لیے وصیت ہو۔ اور اسی وقت جاد اللہ نے اس وصیت پر عمل کرنے کی ٹھانی اور ساتھ ہی جاد اللہ نے یورپ کو خیر باد کہہ کر کینیا، سوڈان، یوگنڈہ اور اس کے آس پاس کے مما لک کو اپنا مسکن بنایا، دعوتِ حق کے لیے ہر مشکل اور پُرخطر راستے پر چلنے سے نہ ہچکچایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھوں ساتھ لاکھ انسان کو دین اسلام کی روشنی سے نوازا۔ جاد اللہ نے افریقہ کے کٹھن ماحول میں اپنی زندگی کے تیس سال گزار دیئے۔ سنہ 2003ء میں افریقہ میں پائی جانے والی بیماریوں میں گھر کر محض چوّن (54) سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی کو جا ملے۔ جاد اللہ کی محنت کے ثمرات ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہے۔ وفات کے ٹھیک دو سال بعد ان کی ماں نے ستر سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔

جاد اللہ اکثر یاد کیا کرتے تھے کہ انکل ابراہیم نے اس کے سترہ سالوں میں کبھی بھی اسے غیر مسلم محسوس نہیں ہونے دیا اور نہ ہی کبھی کہا کہ اسلام قبول کرلو۔ مگر اس کا رویہ ایسا تھا کہ جاد کا اسلام قبول کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ آپ کے سامنے اس واقعے کے بیان کرنے کا فقط یہی مقصد ہے کہ کیا مجھ سمیت ہم میں سے کسی مسلمان کا اخلاق و عادات واطوار و کردار ''انکل ابراہیم'' جیسا ہے کہ کوئی ''غیر مسلم جاد'' ہم سے متاثر ہو کر ''جاد اللہ القرآنی'' بن کر میرے ''مذہب اسلام'' کی اس عمدہ طریقے سے خدمت کر سکے۔

اللہ تعالیٰ مجھ گناہ گار و سیاہ کار سمیت ہم سب مسلمانانِ عالم پر بے حد رحم فرمائے اور عین صراطِ مستقیم پر چلنے کی کامل توفیق عطا فرمائے......آمین یارب العالمین

☆---☆

کچھ مخالفت کی موافقت میں

مصنف: جمیل احمد عدیل
(ایسوسی ایٹ پروفیسر اُردُو، گورنمنٹ سول لائنز کالج لاہور)
انتخا : بشرافت علی تاشف (لیکچرار اُردو)

غالب نے کہا تھا ؎ رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔ مجھے اس مصرعے پر ایک ہی اعتراض ہے کہ غالب نے اپنے حوالے سے اس تجربے کی تخصیص کی ہے۔ حالاں کہ اسے تعمیم کے انداز میں بیان کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ یہ تو انسانی نفسیات کا ناقابل تردید اصول ہے کہ طبع رواں ہونے کا رکنے کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہی اب تک ایجاد نہیں ہوا۔

اب رہا یہ سوال کہ طبع رکتی کیسے ہے؟ تو اس کے دو جوابات ہیں۔ ایک تو یہ کہ طبع اپنے آپ بھی رُک سکتی ہے دوسرے یہ کہ طبع کو خود کوشش کر کے روکنا چاہیے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور کریں گے تو آپ کو مذکورہ اصول انسانی ذات سے صعود کر کے پوری کائنات پر ممتد ہوتا ہوا دکھائی دے گا کہ خارجی سطح پر تبدیلی کا عمل نظام کائنات کا حصہ ہے اور سننے والے کی سماعت سے ''دمادم صدائے کن فیکون'' ٹکرا رہی ہے۔ یعنی تغیر اس میکانزم کا ایک ایسا پرزہ ہے جس کے بغیر یہ مشین حرکت پذیر ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا قدرت نے ثبات صرف تغیر میں رکھا ہے۔

اگر ہم کائنات سے نزول کریں اور سمٹ کر پھر اپنی ذات پر آ جائیں تو ہمیں اس ادراک کی نعمت عطا ہو گی کہ ہم سارا دکھ صرف اس لیے جھیل رہے ہیں کہ ہم تغیر سے مصروف مبارزت ہیں۔ تغیر چونکہ نظام فطرت ہے اور فطرت کے خلاف جنگ کرنے والا لازماً شکست کھا جائے گا، یہ قانون فطرت ہے۔

اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم مسلسل تغیر کے خلاف عملی اعلان بغاوت کر کے ایسی ہزیمت اٹھاتے کہ مکمل طور پر نیست و نابود ہو جاتے۔ لیکن مقام شکر ہے ایک تغیر وہ ہے جس پر ہمیں اختیار نہیں اور وہ پیہم محو عمل ہے۔ وہی ہمیں بچائے ہوئے ہے، زندہ رکھے ہوئے ہے، جسے آپ تندی باد مخالف بھی کہہ سکتے ہیں۔

اصل میں مَیں دہرے پن کا قائل ہوں۔ اللہ نے آنکھیں دیکھنے کے لیے دی ہیں، لیکن آنکھوں کو دیکھنا بھی کم اہم نہیں ہے۔ (خوبصورت آنکھوں کو دیکھنا کتنا خوبصورت عمل ہے، کبھی غور کیا آپ نے)؟ ہونٹوں کی مدد سے ہم اشیائے خورد و نوش نگلتے ہیں لیکن انہی ہونٹوں سے ہم اپنے بچوں کو چومتے ہیں۔ بنانے والے نے ہمارا کوئی عضو بلکہ کائنات کا ایک بھی

ذرہ ایسا نہیں بنایا جو صرف ایک کام پر مختص ہو۔ آپ اس نکتے کو تسلیم کرنے میں عجلت سے کام نہ لیجئے۔ اشیاء اور مظاہر کے متعلق تفکر اور تدبیر آپ کو ان کی باقی جہات سے ضرور متعارف کروائے گا، یوں آپ دریافت کے عمل سے گزرتے ہوئے وہی حظ اور مسرت محسوس کریں گے جو کولمبس نے امریکہ دریافت کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔

اس دہرے پن کا اطلاق جب میں نے حالت سفر پر کیا تو مجھے وہ نتائج ملے جن سے میری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مثلاً دوران سفر آپ کا ذہن غیر معمولی طور پر دراک اور متحرک ہو جاتا ہے۔ حالت حضر میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ وہ سواریاں جن میں بیٹھ کر سوار جسمانی حرکت سے محروم ہو جاتا ہے، مجھے ذہنی تحرک کے باوجود طبعاً ناپسند ہیں۔ ریل کا سفر مجھے از حد عزیز ہے کہ مجھے ثنویت کی تقویت کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ آپ کے لیے میرا مشورہ حاضر ہے کہ اگر آپ کو ریل گاڑی میں سفر کا موقع ملے تو آپ ایک سنجیدہ، سن رسیدہ شخص کی طرح اپنی سیٹ پر جم کر نہ بیٹھے رہیں۔ گاڑی چلتی رہے اور آپ بھی گاڑی کے اندر چلتے رہیں۔ ایک نٹ کھٹ اور کھلنڈرے نوجوان کی طرح۔ ایک سیٹ سے دوسری سیٹ پر۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک۔ ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں۔ اگر مزید توفیق ملے تو ایک بوگی سے دوسری بوگی میں بھی۔ ہر سٹیشن پر اتریں جب گاڑی چل پڑے تو بھاگ کر سوار ہوں۔ اگرچہ یہ کام خطرناک ہے اور عواقب سے ڈرے ہوئے لوگ اس کی بھرپور مخالفت بھی کریں گے۔ لیکن لذت کی معمولی سی رمق بھی قدرت نے خطرے سے باہر نہیں رکھی۔ اس لیے اگر آپ لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو آپ ''رسک'' لیں۔ میں نے خود سدا یہی کیا ہے اور سفر کو سیاحت میں بدل کر وہ انبساط کشید کیا ہے جس کے متعلق وہ مسافر سوچ بھی نہیں سکتا جو آغاز سے اختتام تک ایک ہی جگہ ٹک کر معزز اور معتبر بنا بیٹھا رہے۔

البتہ ایک چیز جس کی میں نے تائید کی ہے وہ ہے ان بزرگوں کی مخالفت۔ جی یہاں میں نے نہ صرف اس موقع پر ان کی مخالفت کی موافقت کی ہے بلکہ مجموعی طور پر جتنا میں مخالف اور مخالفت کے حق میں ہوں شاید ہی دنیا کا کوئی دوسرا فرد ہو۔ کیونکہ دوران سفر یہ شوخی آپ کو ذرا مزہ نہ دے۔ اگر کوئی آپ کو ایسا کرنے سے منع نہ کرے۔ اپنی حیاتی کے باقی اعمال کا بھی اسی تناظر میں جائزہ لے کر دیکھیں تو آپ اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے نشاط اسی کام میں ہے جس کی مخالفت کی جائے۔

دراصل مخالفت، تغیر کا ہی دوسرا نام ہے۔ جب آپ کی اچھی بھلی رواں دواں زندگی میں کوئی خلل واقع ہو جاتا ہے۔ اس کے معینہ راستے پر، بہاؤ میں کوئی چیز مزاحم ہو جاتی ہے تو ایک تبدیلی وجود میں آ کر آپ کو تغیر یعنی مخالفت سے شناسائی کی ثروت عطا کر دیتی ہے۔ ضمناً مزاحمتی ادب کی اہمیت ثابت ہو رہی ہے تو اس میں میری شعوری کوشش کا ہرگز کوئی دخل نہیں۔ آپ کے تمام اعمال و افعال اور نظریات و خیالات کو استقامت اور استقلال بخشنے والی یہی مخالفت ہے۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو کچھ بھی موجود نہ ہو، اسی لیے تمنا کی گئی۔ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔ آپ تھوڑا سا گہرائی میں جا کر دیکھیں، کیا کائنات میں

ایک ذرہ بھی ایسا ہے جس کا مخالف ذرہ موجود نہ ہو؟ آپ مثال اس لیے پیش نہیں کر سکتے کہ کائنات تو کیا زمان و مکاں سے ماوراء ہو کر بھی دیکھیں تو ہمیں ایک ہی ذات ایسی دکھائی دیتی ہے جو اپنی پہچان کے لیے مدمقابل سے بے نیاز ہے۔ لیکن آپ تدبیر کیجئے ہم اتنے مجبور ہیں کہ اس کی شناخت کے لیے بھی ہمیں اس کا عدد تراشنا پڑا۔ اگر چہ اس حریف کی ہم نے توہین کر کے یوں بھی بدلہ لیا ہے کہ خلق کی مخلوق کے قصے کو رنگین کرنے کے لیے اس کا لہو مستعار لیا ہے اور یہ محض اس کی سعادت مندی ہے کہ اس نے مذکورہ قصے میں اپنی خدمات پیش کر دیں، وگرنہ اس آویزش کے ذریعے کہانی کو پرکشش بنانے کا وہ پابند نہ تھا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دو برابر کے باکسر ہوں۔ ان میں سے ایک باکسر اپنے دشمن کے بالکل مبتدی شاگرد سے مقابلے کے لیے تیار ہو جائے۔ اب چاہے جیت ہو یا ہار ہر دو صورتوں میں بڑے باکسر کی سبکی کا ہی پہلو برآمد ہوتا ہے۔ لیکن دیکھئے اس نے اپنی انا اور خودداری کو مسئلہ نہیں بنایا، کہ ہم نے ستیزہ کاری کے لیے اس منفی کردار کو ہمیشہ ہر اس مقام پر زحمت دی ہے، جہاں بھی ہمیں حق کا تشخص اُجاگر کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اور اس تابع فرمان کی برخورداری کہ ایک بار بھی اس نے ہمیں مایوس نہیں لوٹایا۔ لاکھوں کنکریاں برداشت کر کے، حق ہم پر واضح کر کے، وہ پھر آرام کرنے چلا جاتا ہے تا آنکہ ہمیں پھر اس کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ از سرِ نو اپنے طاغوتی کیل کانٹوں سے لیس ہو کر میدانِ عمل میں کود پڑتا ہے۔ سو میرے دل میں اس منفی کردار سے سخت مخالفت کے باوجود ہمیشہ ممنونیت کے جذبات ہی بیدار ہوئے ہیں کہ کہاں کہاں اس بیچارے نے اپنا فریضہ ادا نہیں کیا۔ خالق سے لے کر مخلوق تک کے حق بجانب ہونے کی گواہی کے لیے وہ اپنے سکون اور ذاتی مصروفیات کو یک قلم منسوخ کر کے فوراً فعال ہو جاتا ہے۔

ہم اس کے مخالف رہیں لیکن اس کی مخالفت کی موافقت نہ کرنا تو سراسر ناانصافی ہو گی اور اس مثال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر بھی مخالفت کی موافقت میں اگر ہماری ساری توانائیاں صرف ہو جائیں تو بھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو گا۔

اگر آپ کا کوئی مخالف نہیں ہے تو اس کا مطلب واضح ہے کہ آپ نہیں ہیں۔ اگر آپ کے نظریئے کا کوئی مخالف نہیں ہے تو آپ کا نظریہ ہی نہیں ہے۔ مخالفت تو ایسی نعمت ہے کہ اگر تنکے کے برابر بھی ملے تو اسے قبول کر لینا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ کل کلاں ڈوبتے ہوئے اس تنکے کے سہارے کی ضرورت پڑ جائے۔

آپ نے علی الصبح سفر پر جانا ہو۔ ٹائم پیس کو آپ نے الارم لگایا ہوا ہے۔ آپ نے اٹھتے ہوئے لیور پر ہاتھ پھیر کر اچھی طرح تسلی بھی کر لی ہے۔ عام دنوں میں آپ کو بے خوابی کی شکایت رہتی ہے۔ سخت پریشان رہتے ہیں لیکن اس صبح ٹوٹ کر آپ کو وہ بے مثال نیند آئے گی کہ پھر آپ اس کے نعم البدل کو مدت العمر ترستے ہی رہیں گے۔ ایسا کیوں ہوا؟ سیدھا سا جواب ہے کہ آپ بیدار ہونا چاہتے ہیں، آپ کے اندر کا تغیر اس کی مخالفت میں برسرِ پیکار ہو گیا ہے۔ جاگنے اور سونے کی

ساری لذت اسی کشمکش کی مرہون منت ہے۔ مراد یہ کہ کشش صرف اس چیز میں ہے جس سے روکا جائے۔ ذرا پیچھے جائیں تو ''شجر ممنوعہ'' کا ثمر سوائے اس سے کچھ نہیں تھا کہ اس کے پاس جانے سے روکا گیا تھا۔ اگر اس کے حصول کی مخالفت نہ کی جاتی تو ہمارے بزرگ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ ظاہر ہے کہ پھر یہ دنیا وجود میں نہ آتی۔ یعنی اکوان وعوالم کے عظیم الشان درخت کا بیج ''مخالفت'' ہی ہے۔

جن دنوں میں بے پناہ مصروفیات کی زد میں ہوتا ہوں کہ سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ہوئی۔ تخلیقی کام کے لیے اس سے زیادہ موزوں لمحے مجھے کبھی نصیب نہیں ہوتے۔ ایسا ایسا خیال، ایسا ایسا پیرایہ، جملے کے جملے، بنائے بنائے، ڈھلے ڈھلائے اترتے ہی چلے جاتے ہیں کہ سمجھ نہیں آتی انہیں محفوظ کیسے کروں؟ اور چونکہ غالب کے تتبع میں کعبہ میرے پیچھے ہوتا ہے، اس لیے طبعاً میرا جھکاؤ کلیسا کی طرف ہو جاتا ہے۔ قبلے سے ذرا سی معذرت کی (وہ عالی ظرف ہے ہمیشہ معذرت قبول کر لیتا ہے) چند ساعتیں چرائیں، اپنے ادبی کلیسا میں پناہ طلب کی اور جو من میں بارش ہو رہی تھی اس کے قطرات کو کاغذ پہ منتقل کر کے شانت ہو گئے۔ تثلیث سے پھر اپنے حقیقی معبد توحید کی جانب آئے، فکر کفر سے نجات حاصل کی، ایمان کے دارالایمان میں آئے، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

بندہ جتنا غور کرتا چلا جائے معانی کی پرتیں اس پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ قدرت نے خیر اور شر کی کھینچا تانی سے ہی اس کائنات کو توازن بخشا ہوا ہے۔ آدمی کے جبلی میلان میں روکنے والے کی بجائے کھینچنے والے کی طرف رغبت زیادہ رکھ دی۔ نیکی ہمیشہ روکتی ہے۔ برائی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برائی بلاتی نہیں، تبلیغ نہیں کرتی، بحث مناظر نہیں کرتی، پھر بھی انسان اس کی طرف بے اختیار کھینچا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں گناہگار کی محفل سے اٹھ کر چلے جانا بہت مشکل کام ہے۔ ویسے آپ حیران ہوں گے میرے لیے یہ کبھی مشکل ثابت نہیں ہوا ہمیشہ ناممکن ثابت ہوا ہے۔

دنیا کی سب سے لذیذ لذت یعنی جنسی تحریک وترغیب کا مرکزی نقطہ اگر ایک طرف جنس مخالف ہے تو دوسری طرف مطلق مخالفت ہے۔ مثلاً میاں بیوی ہونا یہ رشتہ زمانے کی موافقت کی بین دلیل ہے۔ دونوں ایک دوسرے میں کتنی کشش محسوس کرتے ہیں؟ آپ کے سامنے کی بات ہے۔ جبکہ محبوب اور محبوبہ کے درمیان سماج کی بھرپور مخالفت سانس لیتی ہے اس لیے چرائے ہوئے بوسوں سے وہ جو لطف وصول کرتے ہیں ظاہر ہے بے مثل و بے نظیر ہے۔ (شادی شدہ) سیانے اسی لیے کہتے ہیں کہ شادی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ درست ہے جو شادی نہیں کرتا وہ پچھتاتا ہے لیکن وہ ایک بار پچھتاتا ہے جبکہ شادی شدہ دو بار پچھتاتا ہے۔

بات وہی لذت طلب کی ہے۔ عالم سوز وساز کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔ وصل کو مرگ آرزو سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بس

پیاسے ہونے کے باوجود آپ شاعر کی تقلید میں ساحل دریا پہ کھڑے رہیں، خواہش پر ٹوٹ کر نہ گریں............ جہاں آپ کی آنکھ لڑی ہے، وہیں نہ دیکھتے رہیں، آئینے کی پیروی میں پریشاں نظری کی استعداد بھی پیدا کریں۔

ہماری ادبی دنیا کے وہی لوگ مجالس میں موضوع گفتگو بنتے ہیں جو مخالفت کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے عمریں صرف کر کے نئے جادے تراشے ہیں۔ آج یہی لوگ قابل ذکر ہیں۔ اس سے ہٹ کر بھی دیکھیں تو ہر روز آپ کی آنکھوں کے سامنے کتنے لوگ مر جاتے ہیں۔ کسی کو خبر تک نہیں ہوتی، اگر ہوتی ہے تو کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کتنے لوگ ہیں جو آج مرنے کے باوجود زندہ ہیں؟ وہی معدودے چند جنہیں موافقت کی گھٹن میں مخالفت کی آکسیجن نصیب ہو گئی۔ اگر آپ بھی جینا چاہتے ہیں تو ضابطوں کے خلاف جہاد کیجئے (گھبرایئے نہیں ممکن ہے آپ کو جیل ہو جائے یا آپ کی جان کام آ جائے، لیکن آپ خاطر جمع رکھیں، دونوں صورتوں میں آپ تغیر یعنی مخالفت کے نمکین پھل سے ضرور لطف اندوز ہو جائیں گے) یعنی اپنے گوشہ عافیت سے باہر نکل آیئے، مخالفت کے تصادم سے نہ صرف تعارف حاصل کیجیے بلکہ اپنے اندر اور باہر اس جنگ کو وہ میدان فراہم کیجیے جو آپ کو آپ کی سابقہ منجمد حالت سے نکال کر نئی متحرک حالت سے شناسا کر دے گا۔ جیسے جیسے یہ میدان کارزار گرم ہوتا چلا جائے گا آپ کا شعور ترقی کرتا چلا جائے گا۔ آپ ایک حالت سے دوسری حالت میں اور دوسری سے تیسری حالت میں منتقل ہوتے رہیں گے اور یہ سلسلہ لا متناہی بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ آپ کا سفر جاری رہے۔ رکئے گا نہیں۔ قبلے کو قبلہ نما اور منزل کو نشان منزل یقین کرتے ہوئے چلتے رہیں۔ اگر کہیں رکیں بھی تو اس مقام پر قیام کا مقصد صرف اور صرف سفر کی اہمیت کو اُجاگر کرنا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ آپ تھک جائیں گے تو یاد رکھئے، آرام کرنے کا حق صرف تھکے ہوئے آدمی کو ہے۔ اب آپ مجھ سے یہ نہ دریافت کیجئے گا کہ ''اگر کوئی آرام کر کے تھک جائے تو؟'' اس سوال کا جواب میں اس لیے نہیں دوں گا کہ یہ میری ذاتی زندگی میں بے جا مداخلت کے مترادف ہے۔

ہاں آپ کو میرے نقطہ نگاہ کی مخالفت کا پورا حق حاصل ہے۔ بلکہ میں آپ کی موافقت کے لیے اپنے آپ کو اس طور رضامند کر سکتا ہوں اگر آپ میرے نتائج فکر سے اتفاق نہ کریں۔ اگر آپ مجھ سے متفق ہیں تو پھر میں آپ کا سب سے بڑا مخالف ہوں۔ آخر میں ایک نصیحت بھی سن لیجیے کہ کبھی بھول کر بھی آپ لندن کے ہائیڈ پارک جانے کی تمنا نہ کیجئے گا کہ خطہ ارض پر اس سے زیادہ بے کیف مقام کوئی نہیں۔

مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر

انتخا : محمد عثمان

)لیب سپروائزر شعبہ کیمسٹری(

لوت تاج محل کو محبت کی علامت قرار دیتے تھے مگر یقین کریں کہ دور عثمانی میں مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر،تعمیرات کی دنیا میں محبت اور عقیدت کی معراج ہے۔ذرا پڑھیے اور اپنے دلوں کو عشق نبوی ﷺ سے منور کریں۔

ترکوں نے جب مسجد نبوی کی تعمیر کا ارادہ کیا تو انھوں نے اپنی وسیع وعریض ریاست مین اعلان کیا کہ انھیں عمارت سازی سے متعلق فنون کے ماہرین درکار ہیں۔اعلان کرنے کی دیر تھی کہ ہر علم کے مانے ہوئے لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔سلطان کے حکم سے ستنبول کے باہر ایک شہر بسایا گیا جس میں اطراف عالم سے آنے والے ان ماہرین کو الگ الگ محلوں میں بسایا گیا۔اس کے بعد عقیدت اور حریت یا ایسا باب شروع ہوا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔خلیفہ وقت جو دنیا کا سب سے بڑا فرمانروا تھا، وہ نئے شہر میں آیا اور ہر شعبے کے ماہر کو تاکید کی کہ اپنے ذہین ترین بچے کو اپنا فن اس طرح سکھائے کہ اسے یکتا و بیمثال کردے۔اسی اثنا میں ترک حکومت اس بچے کو حافظ قرآن اور شہسوار بنائے گی۔دنیا کی تاریخ کا یہ عجیب وغریب منصوبہ کئی سال جاری رہا۔پچیس سال بعد نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جو نہ صرف اپنے شعبے میں یکتائے روزگار تھے بلکہ ہر شخص حافظ قرآن اور باعمل مسلمان بھی تھا۔یہ لگ بھگ پانچ سو لوگ تھے۔اسی دوران ترکوں نے پتھروں کی نئی کانیں دریافت کیں۔کئی جنگلوں سے لکڑیاں کٹوائیں۔تختے حاصل کیے گئے اور شیشے کا سامان بہم پہنچایا گیا۔یہ سارا سامان نبی کریم ﷺ کے شہر پہنچایا گیا تو ادب کا یہ عالم تھا کہ اسے رکھنے کے لیے مدینہ منورہ سے دور ایک بستی بسائی گئی تاکہ شور سے حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ کی بے ادبی اور مدینہ منورہ کا ماحول خراب نہ ہو۔نبی ﷺ کے ادب کی وجہ سے انھیں حکم تھا کہ اگر کسی کٹے پتھر کو اپنی جگہ بٹھانے کے لیے چوٹ لگانے کی ضرورت پیش آئے تو موٹے کپڑے کو پتھر پر بہ بتہ یعنی کئی بار فولڈ کر کے رکھیں پھر لکڑی کے ہتھوڑے سے آہستہ آہستہ سے چوٹ لگائیں تاکہ آواز پیدا نہ ہو اور اگر ترمیم کی ضرورت ہو تو اسے واپس اسی بستی بھیجا جائے، وہاں اسے کاٹ کر درست کیا جائے۔ماہرین کو حکم تھا کہ ہر شخص کام کے دوران باوضو رہے اور درود شریف اور تلاوت قرآن میں مشغول رہے۔ہجرہ مبارک کی جالیوں کو کپڑے سے لپیٹ دیا گیا تاکہ گردوغبار اندر روضہ پاک میں نہ جائے،ستون لگائے گئے کہ ریاض الجنۃ اور روضہ پاک میں نہ جائے،ستون لگائے گئے کہ ریاض الجنۃ اور روضہ پاک پر مٹی نہ گرے۔یہ کام پندرہ سال تک چلتا رہا۔تاریخ عالم گواہ ہے ایسی محبت ایسی عقیدت سے کوئی تعمیر نہ کبھی پہلے ہوئی اور نہ کبھی بعد میں ہوگی۔

مدت سے آرزو تھی سیدھا کرے کوئی

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین راشد
صدر شعبہ اُردو

ذرا دیکھو تو!

ابرار کی شادی ہو رہی ہے۔ صرف گنتی کے تیرہ افراد ہیں جو شامل تقریب ہیں۔ اس کی والدہ اور بہن نے گھر میں ہی کھانا تیار کر لیا ہے۔ دلہن بیاہ کر لائے ہیں تو صرف دو کاروں میں کل چھے افراد۔ من موہنی پیاری سی چاند جیسی دولھن فقط پچیس ہزار میں سب کچھ ہو گیا۔ پچھلے سال اس کی بہن کی شادی پر تو پچیس لاکھ بھی تھوڑے پڑ گئے تھے اور قرضوں کے طویل سلسلے مدتوں خراج لیتے رہے۔ ابرار خود کو پھول سا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہے۔ یہ دولھا، دولھن کے لیے لاکھوں کے جوڑے اور براتیوں کے ٹھٹھ، نہ ولیموں براتوں کے لیے شادی ہالوں کے مہنگے اہتمام۔

یہ کیا ہے ذرا دیکھو تو!

کوئی فوت ہوا ہے۔ نازش کی دادی منوں مٹی تلے جا چھپی۔ گنتی کے چودہ لوگ ایک محفوظ فاصلے سے سوئے شہر خموشاں رواں دواں۔ یہ محلے اڑوس پڑوس کے ہی چند افراد ہیں۔ تنبو شامیانے دیگیں، مہمانوں کی فوج ظفر موج نہ مفتوں کے جھمگٹے۔ کل خرچہ دو ہزار تین سو اناسی۔ فون پر ہی اعزہ و اقارب کو اطلاع اور ان کا اعتذار و تعزیت۔ نہ کسی کی عدم شرکت سے کسی کی ناک کٹی اور نہ ہی شریکے والے کوئی مین میخ نکال سکے۔

یہ کیا ہے دیکھو تو!

پروفیسر صاحب فکرِ قرآن میں محو۔ پچاس کے پیٹے میں ہیں۔ عمر بھر پڑھا اور پڑھایا کیے۔ بیسیوں ڈگریاں کمائیں اور لاکھوں بھاشن دیے۔ صبح و مسا بمشکل تمام سجدہ ریز ہو پاتے تھے۔ قرآن خواں تو تھے لیکن قرآن فہمی سے کوسوں دور۔ چینی سنی یا عربی پڑھی ایک برابر۔ جب سمجھ ہی کچھ نہ آئے تو کیا پڑھنا اور کیا اس پر عمل کرنا۔ قرآن کو جاہلوں کی طرح کتاب ثواب ہی بنائے رکھا۔ راسخ العلم محبوبان خدا کی مانند کتاب ہدایت نہ بنایا۔ روح و قلب شفایاب اور زندگی ہدایت یاب کیوں کر ہوتی جب نسخہ کیمیا کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اس سے محبتوں اور عقیدتوں کے سلسلے فقط چوما چاٹی اور رٹو طوطوں کے طرز پر رہے۔ محض ثواب اور برکت مطمح نظر رہا اور ہدایت و عرفان کی دولت سے لاتعلق رہے۔

اب فکرِ قرآن میں غرق ہیں تو منشائے ربی کے در وا ہو رہے ہیں۔ جسم کے اندر روح کانپ رہی ہے، من کی آنکھیں

کھل رہی ہیں اور بصیرت کے دفینے دسترس میں آ رہے ہیں۔ آنکھیں چھما چھم، دل موم، روح گھائل اور جسم لرزہ براندام۔ والدین کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ اوران کی زیارت کو بمنزلہ حج مقبول گردان رہے ہیں۔ گھر والوں پر خرچ کو صدقہ اور ضرورت مندوں کی امداد کو عین دین قرار دے رہے ہیں۔ نماز و انفاق فی سبیل اللہ کو دینِ اسلام کی سائیکل کے دو پہیے کہہ رہے ہیں۔ تین عدد سیرت النبی ﷺ کی کتب بھی پڑھ ڈالی ہیں۔ لگتا ہے کالج دوبارہ کھلنے پہ جب کالج پہنچیں گے تو ایک نئے انسان ہوں گے جو انسان سازی کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں گے۔

یہ کیا ہے ذرا دیکھو تو!

ننّھے عبدالرحمان کے ابو، امی اور بہن بھائی مل کر لڈو سے دل بہلا رہے ہیں۔ ایک مزے کا کھیل جاری ہے۔ شور ہنگامہ اور نعرے۔ ننّھا عبدالرحمان ماں کے ساتھ ہے تو اس کی بہنا باپ کا ساتھ دے رہی ہے۔ ابھی شام کو شٹاپو کا میچ ہے جس میں سب بہن بھائی زور شور سے حصہ لیں گے جبکہ ابو امی دونوں اطراف بیٹھ کر بیک وقت تماشائی اور امپائر کا کردار ادا کریں گے۔ نعرے بھی لگیں گے اور منہ بھی بسورے جائیں گے۔ کبھی کبھی تو کھیل پاک بھارت کرکٹ میچ کا روپ دھار لیتا ہے۔ میچ اور کھیل کے دوران میں بڑی آپی شکنجبین سے تمام ننھے اور سینئر کھلاڑیوں کی تواضع کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ہر روز روزِ عید بنا ہوا ہے۔ ننھا عبدالرحمان تو سب سے زیادہ excited ہے۔ اس نے زندگی میں اس سے پہلے گھر میں ایسے ہنگامے اور جھمگٹے نہیں دیکھے۔ وہ اس کھیل تماشے پر بہت شاداں ہے اور بار بار اپنی امی سے پوچھتا ہے، پاپا اب ہمارے ساتھ ہی رہا کریں گے ناں؟ اب وہ پہلے کی طرح اپنی ماما کے پاس تو نہیں چلے جائیں گے۔'' اس کی ماں نے اسے ایسے ہی بتایا تھا۔ اسے کیا خبر کہ تلاش رزق میں اسے منہ اندھیرے گھر سے نکلنا اور رات گئے گھر واپس آنا ہوتا ہے کہ یہی اس کی زندگی تھی اور یہی زندگی کا تقاضا۔ فیملی کا یوں اکٹھے ہلاّ گلاّ کرنا تو مہینوں بعد ممکن ہوتا تھا لیکن اب تو ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ وصال کی سی کیفیت ہے۔

یہ کیا ہے، ذرا دیکھو تو!

اس قدر خوش رنگ و خوش آہنگ پرندہ آج تک گھر کے اکلوتے پیڑ پر چہچہانے نہیں آیا تھا۔ وفورِ شوق سے اس کا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ وہ بے اختیار نغمہ سنج ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو، ماحول اور فضا بھی تو صاف شفاف بن چکے ہیں۔ نہ فیکٹریوں کا دھواں اور گرد و غبار ہے اور نہ ہی ٹریفک کا بے ہنگم شور اور زہر آلود سموگ۔ تمام فیکٹریاں، کارخانے، بسیں، ٹرینیں، ٹریفک بند ہونے کی بنا پر اور پچھلے دنوں بار بار رم جھمی بارشوں کے سلسلوں نے ہوا اور فضا کو مہکا اور اُجلا دیا ہے۔ فضا میں پہلے جہاں شور و کثافت ہوتی تھی اب اس کی جگہ عنبر و نسیم کی جانفزا مہکوں کا احساس ہوتا ہے۔ بی بی سی نے بھی تو اگلے ہی دن رپورٹ دی تھی کہ تمام دنیا میں مشین کا پہیا کیا تھما، اوزون کی تباہ شدہ چادر کے شگاف پُر ہو چلے ہیں اور فضاؤں میں ایسا نکھار اور شفافیت آ گئی ہے کہ جالندھر سے ہمالیہ کے برف پوش سلسلے دکھائی دینے لگے ہیں۔ پھر ڈال ڈال پنچھی کیوں نہ زمزمے اور ترنم نہ بکھیریں۔

ذرا یہ بھی تو ملاحظہ ہو!

طلحہ کے منقوط گلابی گال پہلے سے زیادہ بھرے ہوئے اور سرخ دکھائی دے رہے ہیں۔ سب بہن بھائی ہی سرخ وسپید اور گول مٹول ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ گھر کے صحت مند کھابوں اور غذائیت بخش خوان کی برکات ہیں۔ پیزے، شوارمے، پاپڑ، برگروں اور چٹ پٹے پکوانوں سے ان دنوں جان چھوٹی ہے۔ ماں بچوں کے لیے گھر کی مزے مزے کی ڈشیں بناتی ہے تو یہ صحت بخش کھانے نہ صرف لذتِ کام ودہن مہیا کرتے ہیں بلکہ ہر خرد وکلاں کے رخساروں پہ گلاب دہکنے لگتے ہیں۔ نہ پیٹ اور گلے کی بیماریاں اور نہ بے خوابی کے عذاب، والد کی جیب پر بھی بوجھ کم ہے اور سگھڑ ماں کے لیے بھی پہلے سے زیادہ بچت کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

ذرا دیکھو تو یہ کیا ہو گیا!

مساجد ومعابد پر بندشیں اور قدغنیں عائد کر دی گئی ہیں۔ اولوالامر کا حکم کہ عبادات گھر پہ کی جائیں۔ حکومت اور علما کی مشاورت ورہنمائی سے گھر گھر مسجد سج گئی۔ والد امام ہے تو گھر کے تمام افراد مقتدی۔ جن افراد خانہ کو نماز ٹھیک نہیں آتی تھی ان کی بھی درستی اور پختگی جاری ہے۔ پپو کو تو اس میں بڑا مزہ اور لطف آنے لگا ہے۔ وہ رات کو چھت پہ کھڑا ہو کے کئی بار اذان دینے کے روح پرور اور کیف آگیں تجربے سے سرشار ہو چکا ہے۔ والد گرامی نے تمام گھر والوں سے کہا ہے کہ نماز ظہر کے بعد نصف گھنٹے کی قرآن کلاس ہو گی جس میں سب لوگ شامل ہوں گے۔ ایک عربی متن، دوسرا اُردو ترجمہ اور تیسرا انگریزی ورژن پڑھے گا اور خود والد محترم تشریح طلب نکات پر روشنی ڈال کر آسان انداز میں تفہیم قرآن ممکن بنائیں گے۔ بچوں کو اس سب کچھ میں بڑا مزہ آ رہا ہے اور کل تیرھواں سپارہ شروع ہونے جا رہا ہے۔ اس سے پہلے نہ کسی نے ایسے قرآن پڑھا نہ اسے پڑھایا گیا۔ فکر وعلم کے دریچے وا ہو رہے ہیں۔

یہ کون ہے ذرا دیکھو تو!

جھٹپٹے کے بعد نیم تاریکی میں دو تین افراد بڑے بڑے شاپر بیگ دروازوں پر دستک دینے کے بعد باہر رکھ دیتے ہیں۔ چہرے پہ ماسک، نیم تاریکی، پہچان ندارد۔ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ آج تک مذہب فقط نماز روزہ ہی تھا۔ کچھ کے نزدیک ڈاڑھی تمام مذہب کا ملخص اور بعض نے تو تمام عمر عیسائی لوگوں کے برتن میں کھانا نہ کھانا، اصل دین سمجھا ہوا تھا۔ وہ اسی کو دین کی معراج سمجھتے تھے کہ غیر مذہب والوں کے ساتھ نہ تو دعا سلام کا تبادلہ ہو اور نہ ہی ان کے ساتھ کھایا پیا جائے۔ جو مسجد میں باقاعدگی سے جاتا ہے اور چہرے پر ڈاڑھی سجائے ہوئے ہے۔ وہ پکا مسلمان ہے اور معاملات کا معاملہ بس جانے ہی دیجیے۔ مساجد پر تالے پڑے اور گھر معبد بنے تو پتا چلا حقوق اللہ اور مساجد تمام دین نہیں۔ حقوق اللہ دین کا 25% ہیں تو حقوق العباد 75%۔ غامدی صاحب نے تو حیران ہی کر دیا کہ کعبے کے گرد چکر لگانے سے لوگوں کو دیے چکروں کا مداوا نہ ہو

گا۔ حج، عمرہ، روزے، حقوق اللہ سے متعلق تمام گناہ معاف کروا سکتے ہیں لیکن حقوق العباد کے معاملے میں تو اللہ مداخلت کریں گے ہی نہیں۔ وہ بندے کا بندوں سے معاملہ۔ وہی معاف کر سکے گا جس کی حق تلفی ہوئی اور یہ کم ظرف بندے روز حساب نیکیوں کے ڈالر لیے بغیر یا اپنے گناہوں کی غلاظت دیے بغیر معاف کرنے والے نہیں۔ انھیں اس سے کیا غرض کہ نیکیوں کے انبار سمیت آنے والا حقوق العباد کی بیباقی کے بعد مفلس وقلاش قرار پائے اور دوزخ کا ایندھن بنے۔ چشم بصیرت کھلی کہ محض نماز وریش دین نہیں بلکہ دین کا تین چوتھائی حصہ حقوق العباد پر مشتمل ہے۔ تبھی تو کتاب فرقان میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ، انفاق اور صدقہ کا التزام ہے۔ مساکین کو کھانا کھلانا سب سے دلپسند اور حبیب کبریا ﷺ کے مطابق کسی کی ضرورت پوری کرنا مسجد حرام میں کیے گئے مہینا بھر کے اعتکاف سے افضل۔ شاید اس عدم توازن اور افراط وتفریط سے بیزار ہو کر رب کعبہ ومساجد نے حرم وکلیسا تالے لگوا دیے۔ اپنے ماننے والوں کے لیے اسے تازیانہ عبرت بنایا کہ جاؤ محض نمازوں کو دین سمجھنے والو! اب میری مخلوق کی خدمت کر کے حقوق العباد کی ادائیگی کی لذت سے سرشار ہو وو۔ ہمسایوں، مساکین، والدین، اعزہ واقارب، غربا، یتامیٰ اور مفلوک الحال لوگوں کے کام آ ؤ۔ راشن کی تقسیم، گلی گلی اور گوٹھ گوٹھ شاید اسی کا شاخسانہ ہے۔ مصروف ترین دماغ اب دفتر، فیکٹری اور نوکری پر تمام وقت بتانے کے بجائے گھر پر قیدِ طبی میں محصور ہوئے ہیں تو انھیں اپنے آزو بازو میں سسکتی انسانیت اور ننگ وافلاس میں ڈوبے ہمسایوں کا بھی پتا چلا ہے اور وہ ان کی مدد کرنے پہ خود کو آمادہ پا رہے ہیں۔

مولانا جھومتے جھامتے ایک سہ پہر شہر خموشاں کے پاس سے گزرے۔ رشید گل فروش دکانِ گل سجائے اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔ احترام رمضان کا التزام بھی تھا کہ اس کا سگریٹ ہتھیلی اور انگلیوں میں یوں چھپا تھا کہ کوئی تاڑنے والا کوشش کے باوجود فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ ''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے''۔ ''شیدے پتر! کاروبار دھندے کا سنا''، مولانا نے علیک سلیک کرتے ہوئے کہا۔ ''مولبی جی، کچھ نہ پوچھو کھیاں مار رہے ہیں۔ آپن کا تو اس کرونا نے کباڑا کر دیا ہے۔ دھندا ایکدم خلاص۔ پہلے ہر روز تین چار اموات ہوتی تھیں اب ہفتے مین اتنی نہ ہوویں ہیں۔ نہ کوئی حادثہ، نہ اٹیک۔ نہ گردے فیل۔ پتا نہیں سب بیماریاں کہاں چلی گئی ہیں''۔ مولانا مسکراتے ہوئے گویا ہوئے ''او بھائی خیر منگ۔ اچھا ہی ہے''۔ واپسی پر وہ سوچ رہے تھے کہ شیدا گلفروش اور گورکن جو بتا رہے تھے کہ اموات پہلے سے کئی گنا کم ہو گئی ہیں تو یہ بات قابل فہم ہے۔ حادثات ٹریفک نہ ہونے کے باعث ندارد۔ باہر کے کھانے اور عیاشیاں نہ ہونے کی بنا پر امراض میں خاطر خواہ کمی۔ کرونا کی اموات ایک فی صد سے بھی کم اور دیگر امراض تو شاید کرونا کے غلغلے میں ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ کسی کو یاد بھی نہیں کہ ہمارا پیارا دیس بیمارستان اور موتوں کا جنگل ہوا کرتا تھا۔ اب تو صرف ایک کرونا ہے جو ٹیلی ویژن کی سکرین پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن دائیں بائیں کہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ نہ دیگر بیماریاں اور اموات، نہ کرونا کی وہ تباہ کاریاں جو یورپ، انڈیا، امریکا اور چین میں بتائی جا رہی ہیں۔ بعضے تو منگو تانگے والے کی طرح دانش بھگارتے ہوئے صاف کہتے ہیں بھائی سب ڈراما چل رہا ہے، مجھ سے لکھوا لو۔ یہ

الگ بات کہ اگر انھیں کہیں کہ یہی بات لکھ دو تو وہ کہتے ہیں خود لکھ لو ہمیں لکھنا نہیں آتا۔

سوچتا ہوں کرونا زحمت بن کر آیا ہے یا رحمت۔ اسے بُرا کہوں یا اچھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے مجھ سے ملا دیا۔ بقول جون ایلیا:

مجھ سے ملنے کو آپ آئے ہیں

بیٹھیے ، میں بلا کے لاتا ہوں

کتنے فکری مغالطے دور ہوئے۔ سادگی، دین، حضرت انسان کی بے بسی، حقوق العباد کی اہمیت اور فطرت سے انسلاک جیسے کتنے ہی زیست کے پہلو سامنے آئے تو فکر و نظر کے دریچے وا ہونے لگے۔ اب یہ حضرت انسان پر منحصر ہے کہ وہ ان اسباق کو حرزِ جاں بنا کر اپنی آیندہ زندگی کو جمیل و منور بنائے رکھتا ہے یا نہیں۔

☆......☆

محبت

(رانا بشارت علی، لیب سپروائزر)

☆ محبت غور و فکر کی عادت ڈالتی ہے۔ (فیثا غورث)

☆ محبت ایک طلسمی چراغ ہے۔ (کمال اتاترک)

☆ محبت وہ کھیل ہے جس میں عقل ہار جاتی ہے۔ (مسولینی)

☆ محبت انسانی اخلاق کی محافظ تو ہو سکتی ہے مگر ضامن نہیں ہو سکتی۔ (گراہم بیل)

☆ کسی سے محبت کرنا اور اسے کھو دینا محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔ (چینی کہاوت)

☆ ذہانت کی فتح کا نام محبت ہے۔ (امریکی کہاوت)

☆---☆

عورت

☆ خدا تعالیٰ نے عورت کو مرد کی پیشانی سے نہیں بنایا کہ وہ مرد پر حکومت کرے۔ نہ اس کے پاؤں سے کہ وہ اس کی غلامی کرے بل کہ اس کی پسلیوں سے بنایا کہ وہ اس کے دل کے قریب ہے۔

☆ عورت کا بناؤ سنگھار اس کے دل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

☆ عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے اور آدمی مٹی سے۔

☆ ایک عورت صرف ایک راز مخفی رکھ سکتی ہے اور وہ ہے اس کی عمر کا راز۔

☆---☆

جنرل معلومات

نعمان بشیر، سال دوم

1- دنیا میں اس وقت 195 ممالک ہیں۔
2- سورج سب سے پہلے جاپان میں نکلتا ہے۔
3- ریل کی ابتدا 1803ء میں ہوئی۔
4- دنیا کی سب سے بڑی عمارت برج خلیفہ ہے۔
5- قرآن مجید میں 558 رکوع ہیں۔
6- ڈنمارک ایسا ملک ہے جس میں شرح خواندگی 99% ہے۔
7- ونٹ سرف کو انٹرنیٹ کا باپ کہا جاتا ہے۔
8- قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر 282 ہے۔
9- موتیوں کا جزیرہ بحرین کو کہتے ہیں۔
10- ایک میل میں 1.6 کلومیٹر ہوتا ہے۔
11- گائے 24 گھنٹے میں 9 گھنٹے جگالی کرتی ہے۔
12- کوئلے کو بلیک ڈائمنڈ کہا جاتا ہے۔
13- چاند زمین کے گرد سال میں 13 چکر مکمل کر لیتا ہے۔
14- قائداعظمؒ کی وفات پر قومی پرچم 40 دنوں تک سرنگوں رہا۔
15- کوئل اپنا گھونسلا نہیں بناتی ہے۔
16- ایک ٹن میں 1000 کلوگرام ہوتا ہے۔
17- پرندوں کا بادشاہ شاہین کو کہا جاتا ہے۔
18- پاکستان نے اپنا پہلا سفارت خانہ ایران میں بنایا تھا۔
19- مصر نے سب سے پہلے اپنا سفارت خانہ پاکستان میں بنایا تھا۔
20- مینار پاکستان کی بلندی 62 میٹر ہے۔

عزم و ہمت

عمران مصطفےٰ
(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ بیالوجی)

''ماں میں پورے کینیڈا کو دوڑ کر عبور کروں گا چاہے اس کوشش میں جان کی بازی ہی کیوں نہ ہار جاؤں''، یہ الفاظ ہیں اس بلند حوصلہ اور جواں ہمت نوجوان کے جس نے اپنی معذوری کو مجبوری نہیں بنایا بلکہ اپنے آہنی عزم سے کینیڈا کے گلی کوچوں میں دوڑ کر نئی تاریخ رقم کی۔

عزم و ہمت کا استعارہ قرار دیئے جانے والے اس نوجوان کو دنیا ''ٹیری فوکس'' کے نام سے جانتی ہے جو کینیڈا کے صوبہ ''مینی ٹوبا'' کے علاقے ''ونی پگ'' میں 28 جولائی 1958ء کو پیدا ہوا۔ ٹیری کا بچپن بھی عام بچوں کی طرح شرارتوں اور شوخیوں سے بھرا تھا تاہم اس کے اندر پائی جانے والی ایتھلیٹ کی بے چین روح اسے دوسرے بچوں سے ممتاز کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سکول اور بعد ازاں کالج لیول پر بیس بال، باسکٹ بال، رگبی اور فٹ بال کا ایک بہترین کھلاڑی تھا۔

1977ء میں جب وہ محض 18 سال کا تھا اسے ہڈیوں کے کینسر نے آلیا۔ چھ ماہ بعد اس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے چھ انچ اوپر تک کاٹنا پڑی تا کہ مرض جسم کے باقی حصوں تک نہ پہنچے۔ اس کے بعد تقریباً 18 ماہ تک ٹیری کو کیموتھراپی کے تکلیف دہ عمل سے گزرنا پڑا۔ علاج کے دوران ٹیری کا واسطہ کینسر سے متاثرہ سینکڑوں مریضوں سے پڑا جن میں اکثریت بچوں کی تھی۔ اس دوران ٹیری نے مشاہدہ کیا کہ اگر کینسر کے شعبہ میں ریسرچ کا دائرہ کار بڑھایا جائے تو اس موذی مرض سے مقابلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ یہی وہ وقت تھا جب ٹیری نے معذوری کے باوجود پورے کینیڈا میں دوڑنے کا فیصلہ کیا جس کا مقصد کینسر سے متعلق آگاہی اور ریسرچ کی مد میں فنڈ ریزنگ تھا۔ اس نے اپنی اس دوڑ کو ''میراتھن آف ہوپ'' کا نام دیا۔

ابتداء میں ٹیری کی فیملی، دوستوں اور معالجین نے اس کے منصوبے کی مخالفت کی تاہم ٹیری یہ جانتے ہوئے بھی کہ مصنوعی ٹانگ کی ناقابل برداشت درد اور تکلیف سارے سفر میں اس کے ساتھ رہے گی، یومیہ بیالیس کلومیٹر فاصلہ کے ساتھ (انٹرنیشنل میراتھن کا معیاری فاصلہ) کل آٹھ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ٹیری نے اپنی مہم کا آغاز اپریل 1980ء میں، نیوفاؤنڈ لینڈ صوبہ کے شہر سینٹ جان سے کیا۔ مہم کے آغاز میں لوگوں کی طرف سے ملنے والا ریسپانس انتہائی مایوس کن رہا۔ لیکن ٹیری نے ہمت نہ ہاری اور آہستہ آہستہ فنڈ ریزنگ مہم کامیابی کی

طرف گامزن ہوگئی۔ ٹیری اپنے سفر کے دوران، نوااسکوشیا، کیوبک، اونٹاریو جیسے صوبوں سے گزرا۔ مصنوعی ٹانگ کے علاوہ، موسمی حالات، زبان، لوگوں کی طرف سے عدم دلچسپی جیسے مسائل بھی ٹیری کی ہمت نہ توڑ سکے۔ ہرگزرتے دن کے ساتھ لوگوں کی طرف سے ملنے والے ریسپانس سے ٹیری کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے۔ مہم کے دوران ٹیری کی ملاقات کینیڈین وزیراعظم سے بھی ہوئی۔ مختلف ریاستوں کی طرف سے ملنے والا پروٹوکول اس کے علاوہ تھا۔ ٹیری کی چندہ مہم مقبولیت کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ میڈیا کا کوئی دن ٹیری کی خبر سے خالی نہ جاتا تھا اور وہ ٹیری جسے ابتداء میں چند ڈالرز ہی مل پائے تھے اب وہ دن میں ہزاروں ڈالرز عطیات کے نام پر وصول کر رہا تھا۔

مسلسل دوڑنے کی وجہ سے اب ٹیری کی حالت خراب رہنے لگی تھی۔ لیکن لوگوں کے منع کرنے کے باوجود ٹیری نے اپنی میراتھن مہم جاری رکھی۔ یہ اگست کے آخری ہفتے کی بات تھی جب ٹیری کو سینے میں درد کی شکایت ہوئی۔ یکم ستمبر کو انٹاریو صوبے کے علاقے تھنڈر بے میں دوڑتے ہوئے ٹیری کو دمے کا شدید اٹیک ہوا۔ جس کے بعد اسے قریبی اسپتال لے جایا گیا۔ اگلے روز ایک پریس کانفرنس میں ٹیری نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ اس کا کینسر پھیپھڑوں تک پھیل گیا ہے۔ جس کے سبب فی الحال وہ یہ مہم جاری نہیں رکھ پائے گا۔

ٹیری نے اپنی 143 روزہ مہم کے دوران روزانہ 42 کلومیٹر دوڑ کے ساتھ 5373 کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ جو کہ اس کے اعلان کردہ فاصلے کا تین چوتھائی بنتا ہے۔ ٹیری نے معذوری اور سخت مصائب کے باوجود کتنا فاصلہ طے کیا اس بات کا اندازہ آپ یوں لگالیں کہ کراچی اور اسلام آباد کے درمیان تقریباً 1400 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ اپنی اس مہم کے دوران ٹیری نے عطیات کی مد میں سترہ لاکھ ڈالر وصول کیے۔ ٹیری جانتا تھا کہ اس کی جمع کردہ رقم ہدف سے بہت کم ہے لیکن کینیڈین عوام نے اسے مایوس نہ کیا بلکہ اس کی بیماری کے اگلے ہی ہفتے مزید ایک کروڑ ڈالر کے عطیات جمع کر لیے گئے جس میں مختلف صوبائی حکومتوں نے بھی حصہ ڈالا۔

اپریل 1981ء تک عطیات کی رقم دو کروڑ چالیس لاکھ ڈالر تک پہنچ گئی یہی ہدف ٹیری کا خواب تھا۔ اس دوران ٹیری کا علاج جاری رہا۔ علالت کے دوران ٹیری کے مداحوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا تھا جو اسے ڈاک کی صورت میں ہر روز ہزاروں کی تعداد میں نیک خواہشات کا پیغام بھیجتے تھے۔ ٹیری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کینیڈا کے کسی بھی کونے سے لکھے گئے خط پر اگر صرف ''ٹیری فوکس کینیڈا'' درج ہوتا تو وہ بنا کسی رکاوٹ کے ٹیری تک پہنچ جاتا تھا۔

انسانی تاریخ کا یہ عظیم کردار 28 جون 1981ء کو موت کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ ٹیری کی وفات پر کینیڈین پرچم سرنگوں رہا۔ جب کہ کینیڈین وزیراعظم نے ایوان سے خطاب کے دوران ٹیری کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

''قوموں کی زندگی میں بہت کم ایسے مواقع آتے ہیں جب تمام قوم کسی ایک شخص کی بلند حوصلگی اور جواں ہمتی کے

باعث اس کی زندگی میں بھی اور اس کی موت پر بھی ایک ہو جائے۔ٹیری فوکس ایک ایسا نوجوان تھا جس نے ہم سب کو انسانی جذبے اور ہمت کے ذریعے پریشانیوں پر فتح حاصل کرنے کا طریقہ سمجھا دیا۔

ٹیری فوکس کینیڈا کا سب سے کم عمر شخص تھا جسے زندگی ہی میں کینیڈا کا سب سے بڑا شہری اعزاز ''آڈر آف کینیڈا'' عطا کیا گیا اسی طرح برٹش کولمبیا کی صوبائی حکومت نے اسے ''آڈر آف ڈاگ وڈ'' سے نوازا۔1980ء میں ٹیری کو ملک کا کھیلوں کا سب سے بڑا ایوارڈ ''لیو مارش ایوارڈ'' دیا گیا اور اس کا نام ''آل ٹائم گریٹ کینیڈین اتھلیٹس'' کی فہرست میں بھی شامل کر لیا گیا۔

اس کے علاوہ 27 جون 1981ء کو کینیڈا کے محکمہ ڈاک نے روایت کے برعکس ٹیری فوکس کا یادگاری ٹکٹ جاری کیا واضح رہے محکمے کی روایت کے مطابق کینیڈا میں زندہ شخص کا یادگاری ٹکٹ جاری نہیں کیا جاتا بلکہ انتقال کر جانے والے کسی بھی اہل شخص کا یادگاری ٹکٹ اس کے انتقال کے تقریباً دس سال بعد جاری کیا جاتا ہے۔ٹیری وہ واحد کینیڈین شہری ہے جس کی تصویر ایک ڈالر کے سکے پر ہے۔

ان اعزازات کے علاوہ اس وقت کینیڈا میں لگ بھگ 32 سڑکیں، ہائی ویز اور راستے ٹیری کے نام سے منسوب ہیں 14 اسکولوں اور کئی لائبریریوں کے نام ٹیری کے نام پر رکھے گئے ہیں 1986ء میں اس اسکول کا نام جہاں سے ٹیری نے گریجویشن کیا تھا تبدیل کر کے ٹیری فوکس سیکنڈری اسکول رکھ دیا گیا ہے اسکولوں اور لائبریروں کے علاوہ ایک درجن سے زائد عمارتیں بھی ٹیری فوکس کے نام سے پہچانی جاتی ہیں جس میں وینکور شہر میں واقع ''فوکس کینسر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' بھی شامل ہے کینیڈا کے طول وعرض میں ٹیری فوکس کے سات مجسمے بھی ایستادہ کیے گئے جن کے ساتھ ٹیری کی عزم و ہمت کی داستان رقم ہے ایک کھلاڑی ہونے کے باعث نو ''فٹ نس سینٹر'' اور جمنیزیم بھی ٹیری کی یاد دلاتے ہیں اس کے علاوہ برٹش کولمبیا کی صوبائی حکومت نے علاقے میں موجود ایک پہاڑی کا نام تبدیل کر کے ''ٹیری فوکس ماؤنٹین'' رکھا ہے اور اس کے اردگرد کے علاقے کو بھی ''ٹیری فوکس پارک'' کا درجہ دیا ہے۔1999 میں کینیڈا کے ایک قومی سروے میں عوام نے ٹیری کو ''عظیم ترین ہیرو'' کا درجہ دیا تھا۔

2010ء میں کینیڈا میں منعقد ہونے والے سرمائی اولمپک میں جن آٹھ افراد نے افتتاحی تقریب میں اولمپک پرچم لہرایا تھا ان میں سے ایک ٹیری فوکس کی والدہ بیٹی فوکس بھی تھیں۔ٹیری فوکس کی مصنوعی ٹانگ اور اس کے جوتے برٹش کولمبیا کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔

مشہور کینیڈین تاجر اور فورسیزن ہوٹلز کے مالک ''ایسا ڈور شارپ'' وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ٹیری فوکس کے نام سے سالانہ دوڑ کا آغاز کیا یہ ایک ایسی دور ہے جس میں ہار جیت نہیں ہوتی بلکہ کینسر کے علاج کی تحقیق کے حوالے سے عطیات

اکٹھے کیے جاتے ہیں ''ایسا ڈورشارپ'' کا جواں سال بیٹا کینسر کے ہاتھوں جان کی بازی ہار گیا تھا۔شارپ اور ٹیری فوکس کے خاندان کی کوششوں سے پہلی دوڑ ٹیری کے انتقال کے دومہینوں کے بعد 13 ستمبر 1981ء میں ہوئی جس میں تین لاکھ افراد نے حصہ لیا اور پینتیس لاکھ ڈالر کا چندہ اکٹھا کیا گیا چھے سال بعد ہی یہ ایک بین الاقوامی ایونٹ بن گیا جو دنیا کے ساٹھ ممالک میں ہر سال ستمبر میں منعقد کیا جاتا ہے ٹیری فوکس فاؤنڈیشن کے مطابق اب تک وہ کینسر کے علاج میں تحقیق کے لیے 750 ملین ڈالر سے زائد رقم فراہم کر چکے ہیں جس میں اہم کردار ''ٹیری فوکس رن'' ایونٹ کا ہے۔اس رقم کی معاونت سے کینسر کے علاج میں بیش بہا ترقی ہوئی ہے دنیا بھر میں ریس کا اہتمام عموماً کینیڈین سفارت خانے ، ہائی کمیشن اور ٹیری فوکس فاؤنڈیشن کی نمائندہ تنظیمیں کرتی ہیں۔

اپنی صلاحیت کے اعتبار سے ٹیری فوکس ایک عام ایتھلیٹ تھا، عالمی معیار کے اعتبار سے درمیانہ درجے کا میراتھن بھاگنے والا۔لیکن اس نے انسانی تاریخ میں موجود سب سے زیادہ مشکل میراتھن مکمل کی۔اسی ٹیری فوکس نے ہزاروں لوگوں کے مجمعے کے سامنے اپنی دوڑ کے دوران پُر جوش اور بھر پور تقریریں کیں۔اکیلا بھاگنے والا ایتھلیٹ کہ جس نے بے رحم مرض سے گزر کر اور اپنے مقصد زندگی کو پا لینے کے بعد اپنی پوری قوم کے تصور و خیال پر حکمرانی کی اور ایک لازوال ہیرو بن گیا۔اس ساری کامیابی کے پیچھے کیا چیز کارفرما تھی۔زندگی کی معنویت اور زندہ رہنے کا مقصد۔

ٹیری کی حیرت انگیز کامیابی کا راز یہ ہے کہ اُس کی زندگی کا مقصد اور اس مقصد کے حصول کی جانب اس کی لگن خود اس کی اپنی ذاتی مشکلوں اور پریشانیوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔اگر ہم اس کہانی کو پوری طرح سمجھ سکیں تو شاید یہ ہمارے طرزِ احساس کو بھر پور انداز سے تبدیل کر دینے کی بھر پور صلاحیت رکھتی ہے۔ہمیں یہ بات واضح طور پر بتاتی ہے کہ کتنی بے کار ہے وہ زندگی کہ جو صرف اور صرف اپنے لیے اور اپنی ضروریات کے لیے اور محض اپنی ذاتی خواہشوں کے لیے بسر کی جائے۔

تو ہماری زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔؟؟

اس سوال کا جواب بہت سادہ اور آسان ہے۔بالکل وہی جو ٹیری فوکس کی زندگی کا تھا یا ایسے ہی اَن گنت باہمت لوگوں کی زندگی کا ہوتا ہے۔یہ مقصد ہے زندگی میں حصہ دار بننا۔
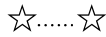
دلچسپ اور سبق آموز واقعہ

صنوبر ناز (ایم۔اے انگلش پارٹ ٹو)

خلیفہ ہارون الرشید عباسی خاندان کا پانچواں خلیفہ تھا، عباسیوں نے طویل عرصے تک اسلامی دنیا پر حکومت کی لیکن ان میں سے شہرت صرف ہارون الرشید کو نصیب ہوئی۔ ہارون الرشید کے دور میں ایک بار بہت بڑا قحط پڑ گیا۔ اس قحط کے اثرات سمرقند سے لے کر بغداد تک اور کوفہ سے لے کر مراکش تک ظاہر ہونے لگے۔ ہارون الرشید نے اس قحط سے نمٹنے کے لیے تمام تدبیریں آزمالیں، اس نے غلے کے گودام کھول دیئے، ٹیکس معاف کر دیئے، پوری سلطنت میں سرکاری لنگر خانے قائم کر دیئے اور تمام امراء اور تاجروں کو متاثرین کی مدد کے لیے موبلائز کر دیا لیکن اس کے باوجود عوام کے حالات ٹھیک نہ ہوئے۔ ایک رات ہارون الرشید شدید پریشانی میں تھا، اسے نیند نہیں آ رہی تھی، ٹینشن کے اس عالم میں اس نے اپنے وزیراعظم یحییٰ بن خالد کو طلب کیا، یحییٰ بن خالد ہارون الرشید کا استاد بھی تھا۔ اس نے بچپن سے بادشاہ کی تربیت کی تھی۔ ہارون الرشید نے یحییٰ خالد سے کہا ''استاد محترم آپ مجھے کوئی ایسی کہانی، کوئی ایسی داستان سنائیں جسے سن کر مجھے قرار آ جائے'' یحییٰ بن خالد مسکرایا اور عرض کیا ''بادشاہ سلامت میں نے اللہ کے کسی نبی کی حیات طیبہ میں ایک داستان پڑھی تھی داستان مقدر، قسمت اور اللہ کی رضا کی سب سے بڑی اور شاندار تشریح ہے۔ آپ اگر...... اجازت دیں تو میں وہ داستان آپ کے سامنے دہرا دوں'' بادشاہ نے بے چینی سے فرمایا ''یا استاد فوراً فرمایئے۔ میری جان حلق میں اٹک رہی ہے۔'' یحییٰ خالد نے عرض کیا ''کسی جنگل میں ایک بندریا سفر کے لیے روانہ ہونے لگی، اس کا ایک بچہ تھا، وہ بچے کو ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی چنانچہ وہ شیر کے پاس گئی اور اس سے عرض کیا ''جناب آپ جنگل کے بادشاہ ہیں، میں سفر پر روانہ ہونے لگی ہوں، میری خواہش ہے آپ میرے بچے کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں'' شیر نے حامی بھر لی، بندریا نے اپنا بچہ شیر کے حوالے کر دیا، شیر نے بچہ اپنے کندھے پر بٹھا لیا، بندریا سفر پر روانہ ہو گئی۔ اب شیر روزانہ بندر کے بچے کو کندھے پر بٹھاتا اور جنگل میں اپنے روزمرہ کے کام کرتا رہتا۔ ایک دن وہ جنگل میں گھوم رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک چیل نے ڈائی لگائی، شیر کے قریب پہنچی، بندریا کا بچہ اُٹھایا اور آسمان میں گم ہو گئی، شیر جنگل میں بھاگا دوڑا لیکن وہ چیل کو نہ پکڑ سکا'' یحییٰ خالد رکا، اس نے سانس لیا اور خلیفہ ہارون الرشید سے عرض کیا ''بادشاہ سلامت چند دن بعد بندریا واپس آئی اور شیر سے اپنے بچے کا مطالبہ کر دیا۔ شیر نے شرمندگی سے جواب دیا، تمہارا بچہ تو چیل لے گئی ہے، بندریا کو غصہ آ گیا اور اس نے چلا کر کہا ''تم کیسے بادشاہ ہو، تم ایک امانت کی حفاظت نہیں کر سکے، تم اس سارے

جنگل کا نظام کیسے چلاؤ گے'' شیر نے افسوس سے سر ہلایا اور بولا ''میں زمین کا بادشاہوں' اگر زمین سے کوئی آفت تمہارے بچے کی طرف بڑھتی تو میں اسے روک لیتا لیکن یہ آفت آسمان سے اُتری تھی اور آسمان کی آفتیں صرف اور صرف آسمان والا روک سکتا ہے۔'' یہ کہانی سنانے کے بعد یحییٰ بن خالد نے ہارون الرشید سے عرض کیا ''بادشاہ سلامت قحط کی یہ آفت بھی اگر زمین سے نکلی ہوتی تو آپ اسے روک لیتے، یہ آسمان کا عذاب ہے، اسے صرف اللہ تعالیٰ روک سکتا ہے۔ یہ آسمان کا عذاب ہے، اسے صرف اللہ تعالیٰ روک سکتا ہے چنانچہ آپ اسے رکوانے کے لیے بادشاہ نہ بنیں، فقیر بنیں، یہ آفت رک جائے گی۔'' دنیا میں آفتیں دو قسم کی ہوتی ہیں، آسمانی مصیبتیں اور زمینی آفتیں۔ آسمانی آفت سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا ضروری ہوتا ہے جبکہ زمینی آفت سے بچاؤ کے لیے انسانوں کا متحد ہونا، وسائل کا بھرپور استعمال اور حکمرانوں کا اخلاص درکار ہوتا ہے۔ یحییٰ بن خالد نے ہارون الرشید کو کہا تھا ''بادشاہ سلامت آسمانی آفتیں اس وقت تک ختم نہیں ہوتیں جب تک انسان اپنے رب کو راضی نہیں کر لیتا، آپ اس آفت کا مقابلہ بادشاہ بن کر نہیں کر سکیں گے چنانچہ آپ فقیر بن جایئے۔ اللہ کے حضور گر جایئے، اس سے توبہ کیجیے، اس سے مدد مانگیے۔'' دنیا کے تمام مسائل اور ان کے حل کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہوتا ہے جتنا ماتھے اور جائے نماز میں ہوتا ہے لیکن افسوس ہم اپنے مسائل کے لیے سات سمندر پار تو جا سکتے ہیں لیکن ماتھے اور جائے نماز کے درمیان موجود چند انچ کا فاصلہ طے نہیں کر سکتے۔
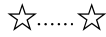
بچے نالائق ہی اچھے

میں کراچی میں ایک صاحب کے گھر گیا، ان کا بیٹا بہت اچھی طرح ان کی خدمت کر رہا تھا، میں نے بیٹے کی تعریف کی تو وہ صاحب ہنس پڑے۔ میں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا، میرے پانچ بیٹے ہیں، چار لائق اور یہ ایک نالائق، آج سارے لائق ملک سے باہر بیٹھے ہیں جبکہ یہ ایک نالائق دن رات میری خدمت کرتا ہے، میں اسے دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں کہتا ہوں ''بچے نالائق ہی اچھے''۔
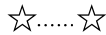
تربیت اور ماحول

اقرا کنول (ایم۔اے اردو)

وزیر کی جان پہ بنی ہوئی تھی، فقیر بات ہی نہیں سن رہا تھا، آخر طویل منتِ سماجت کے بعد فقیر نے سر اُٹھایا،

ہاں بول کیا کہنا ہے؟

وزیر نے ہاتھ جوڑے اور بتانا شروع کیا کہ

ایک مہینہ پہلے ہمارے بادشاہ سلامت نے اچانک دربار میں ایک سوال اُچھالا کہ کامیاب کردار کے لیے تربیت زیادہ کارآمد ہے یا ماحول؟

میرے ایک ہم منصب وزیر نے جھٹ سے کہا کہ عالی جاہ! تربیت

جبکہ میں نے عجلت میں کہا جناب! ماحول، ماحول تربیت پر فوقیت رکھتا ہے۔

بادشاہ سلامت نے ہماری طرف رعونت سے دیکھا اور فرمایا تم دونوں کو اپنا اپنا جواب عملی طور پر ثابت کرنا ہوگا جو ثابت نہ کرسکا اس کا سر قلم کردیا جائے گا اور اس کے لیے ہمیں ایک ماہ کی مہلت دے دی۔

ہم دونوں اپنے جواب کی عملی تعبیر تلاش کرنے میں لگ گئے، میں سوچ سوچ کے پاگل ہونے کے قریب تھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چوبیس دن بعد اچانک میرے ہم منصب وزیر نے میری موت کے پروانے پر گویا دستخط کرتے ہوئے دربار میں اپنے جواب کو عملی طور پر ثابت کرنے کی اجازت چاہی۔

اجازت ملنے پر اس نے دربار میں کھڑے ہوکر تالی بجائی تالی بجتے ہی ایک ایسا منظر سامنے آیا کہ بادشاہ سمیت تمام اہلِ دربار کی سانسیں سینہ میں اٹک گئیں، دربار کے ایک دروازے سے دس بلیاں منہ میں پلیٹیں لیے جن میں جلتی ہوئی موم بتیاں تھیں ایک قطار میں خراماں خراماں چلتی دربار کے دوسرے دروازے سے نکل گئیں، نہ پلیٹیں گریں اور نہ موم بتیاں بجھیں۔

دربار تعریف وتوصیف کے نعروں سے گونج اُٹھا، میرے ہم منصب نے بادشاہ کی طرف دیکھا اور بولا، حضور! یہ سب تربیت ہی ہے کہ جس نے جانور تک کو اس درجہ نظم وضبط کا عادی بنادیا۔

بادشاہ نے میری جانب دیکھا۔

مجھے اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی میں دربار سے نکل آیا، تبھی ایک شخص نے آپ کا نام لیا کہ میرے مسئلے کا حل آپ

کے پاس ہی ہوسکتا ہے میں دو دن کی مسافت کے بعد یہاں پہنچا ہوں، دی گئی مدت میں سے چار دن باقی ہیں اب میرا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

فقیر نے سر جھکایا اور آہستہ سے بولا واپس جاؤ اور بادشاہ سے کہو کہ تیسویں دن بھرے دربار میں ماحول کی افادیت ثابت کرو گے۔

مگر میں تو یہ کبھی نہ کرسکوں گا۔ وزیر نے لاچارگی سے کہا۔

آخری دن میں خود دربار میں آؤں گا۔ فقیر نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

وزیر مایوسی اور پریشانی کی حالت میں واپس دربار چلا آیا۔

مقررہ مدت کا آخری دن تھا دربار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

وزیر کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا سب کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اُٹھتی تھیں کہ اچانک ایک مفلوک الحال سا شخص اپنا مختصر سامان کا تھیلا اُٹھائے دربار میں داخل ہوا، بادشاہ کی طرف دیکھا اور بولا، وقت کم ہے میں نے واپس جانا ہے اس وزیر سے کہو تربیت کی افادیت کا ثبوت دوبارہ پیش کرے۔ تھوڑی دیر بعد ہی دوسرے وزیر نے تالی بجائی اور دوبارہ وہی منظر پلٹا، دربار کے دروازہ سے دس بلیاں اسی کیفیت میں چلتی ہوئی سامنے والے دروازے کی طرف بڑھنے لگیں، سارا مجمع سانس روکے یہ منظر دیکھ رہا تھا وزیر نے امید بھری نگاہوں سے فقیر کی طرف دیکھا، جب بلیاں عین دربار کے درمیان پہنچیں تو فقیر آگے بڑھا اور ان کے درمیان جا کے اپنا تھیلا اُلٹ دیا، تھیلے میں سے موٹے تازے چوہے نکلے اور دربار میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، بلیوں کی نظر جیسے ہی چوہوں پر پڑی انہوں نے منہ کھول دیئے پلیٹیں اور موم بتیاں دربار میں بکھر گئیں، ہر طرف بھگدڑ مچ گئی بلیاں چوہوں کے پیچھے لوگوں کی جھولیوں میں گھسنے لگیں، لوگ کرسیوں پر اُچھلنے لگے دربار کا سارا انظام درہم برہم ہو گیا۔

فقیر نے بادشاہ کی طرف دیکھا بولا آپ کسی جنس کی جیسی بھی اچھی تربیت کرلیں اگر اس کے ساتھ اسے اچھا ماحول فراہم نہیں کریں گے تو تربیت کہیں نہ کہیں اپنا اثر کھو دے گی۔

کامیاب کردار کے لیے تربیت کے ساتھ ساتھ بہتر ماحول بے حد ضروری ہے۔

اس سے پہلے کہ بادشاہ اسے روکتا فقیر دربار کے دروازے سے نکل گیا تھا۔

ہمارے ہاں ساری ذمے داری استاد کی تربیت پر ڈال دی جاتی ہے گھروں کا کیا ماحول ہے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

سائنس ہمیں کہاں سے کہاں لے آئی......

سیرت افضل
(ایم۔ایس سی ریاضی)

1- پہلے: وہ کنویں کا میلا اور گدلا پانی پی کر 100 سال جی لیتے تھے۔
اب: نیسلے اور پیور لائف کا خالص شفاف پانی پی کر بھی چالیس سال میں بوڑھے ہو رہے ہیں۔

2- پہلے: وہ گھانی کا میلا سا تیل کھا کر اور سر پر لگا کر بڑھاپے میں بھی محنت کر لیتے تھے۔
اب: ہم ڈبل فلٹر اور جدید پلانٹ پر تیار کوکنگ آئل اور گھی میں پکا کھانا کھا کر جوانی میں ہی ہانپ رہے ہیں۔

3- پہلے: وہ ڈلے والا نمک کھا کر بیمار نہ پڑتے تھے۔
اب: ہم آیوڈین والا نمک کھا کر ہائی اور لو بلڈ پریشر کا شکار ہیں۔

4- پہلے: وہ نیم، ببول، کوئلہ اور نمک سے دانت چمکاتے تھے اور 80 سال کی عمر تک بھی چبا چبا کر کھاتے تھے۔
اب: کولگیٹ اور ڈاکٹر ٹوتھ پیسٹ والے روز ڈینٹیسٹ کے چکر لگاتے ہیں۔

5- پہلے: صرف روکھی سوکھی روٹی کھا کر فٹ رہتے تھے۔
اب: اب برگر، چکن کڑاہی، شوارمے، وٹامن اور فوڈ سپلیمنٹ کھا کر بھی قدم نہیں اُٹھایا جاتا۔

6- پہلے: لوگ پڑھنا لکھنا کم جانتے تھے مگر جاہل نہیں تھے۔
اب: ماسٹر لیول ہو کر بھی جہالت کی انتہا پر ہیں۔

7- پہلے: حکیم نبض پکڑ کر بیماری بتا دیتے تھے۔
اب: سپیشلسٹ ساری جانچ کرانے پر بھی بیماری نہیں جان پاتے ہیں۔

8- پہلے: وہ سات آٹھ بچے پیدا کرنے والی مائیں، جنہیں شاید ہی ڈاکٹر میسر آتا تھا 80 سال کی ہونے پر بھی کھیتوں میں کام کرتی تھی۔
اب: ڈاکٹر کی دیکھ بھال میں رہتے ہوئے بھی نا وہ ہمت نا وہ طاقت رہی۔

9- پہلے: کالے پیلے گڑ کی مٹھائیاں ٹھوس ٹھوس کر کھاتے تھے۔

اب: مٹھائی کی بات کرنے سے پہلے ہی شوگر کی بیماری ہو جاتی ہے۔

10- پہلے: بزرگوں کے کبھی گھٹنے نہیں دکھتے تھے۔

اب: جوان بھی گھٹنوں اور کمر درد کا شکار ہیں۔

11- پہلے: 100 واٹ کے بلب ساری رات جلاتے اور 200 واٹ کا ٹی وی چلا کر بھی بجلی کا بل 200 روپیہ مہینہ آتا تھا۔

اب: 5 واٹ (5 Watts) کا ایل ای ڈی انرجی سیور اور 30 واٹ کے LED ٹی وی میں 2000 فی مہینہ سے کم بل نہیں آتا۔

12- پہلے: خط لکھ کر سب کی خبر رکھتے تھے۔

اب: ٹیلی فون، موبائل فون، انٹرنیٹ ہو کر بھی رشتے داروں کی کوئی خیر خبر نہیں۔

13- پہلے: غریب اور کم آمدنی والے بھی پورے کپڑے پہنتے تھے۔

اب: جتنا کوئی امیر ہوتا ہے اس کے کپڑے اتنے کم ہوتے جاتے ہیں۔

سمجھ نہیں آتا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟

کیوں کھڑے ہیں؟

کیا کھویا کیا پایا؟

سائنس ہمارے لیے رحمت ہے یا زحمت؟

خاندان اور خون کی پہچان

آمنہ فرزند
(ایم اے انگلش)

سلطان محمود غزنوی کا دربار لگا ہوا تھا۔ دربار میں ہزاروں افراد شریک تھے جن میں اولیا قطب اور ابدال بھی تھے۔ سلطان محمود نے سب کو مخاطب کر کے کہا کوئی شخص مجھے حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت کرا سکتا ہے۔

سب خاموش رہے دربار میں بیٹھا اک غریب دیہاتی کھڑا ہوا اور کہا، میں زیارت کرا سکتا ہوں۔ سلطان نے شرائط پوچھی تو عرض کرنے لگا، چھ ماہ دریا کے کنارے چلہ کاٹنا ہوگا لیکن میں اک غریب ہوں میرے گھر کا خرچا آپ کو اُٹھانا ہوگا۔

سلطان نے شرط منظور کر لی اس شخص کو چلہ کے لیئے بھیج دیا گیا اور گھر کا خرچہ بادشاہ کے ذمے ہو گیا۔

چھ ماہ گزرنے کے بعد سلطان نے اس شخص کو دربار میں حاضر کیا اور پوچھا تو دیہاتی کہنے لگا حضور کچھ وظائف اُلٹے ہو گئے ہیں لہٰذا چھ ماہ مزید لگیں گے۔

مزید چھ ماہ گزرنے کے بعد سلطان محمود کے دربار میں اس شخص کو دوبارہ پیش کیا گیا تو بادشاہ نے پوچھا میرے کام کا کیا ہوا......؟ یہ بات سن کے دیہاتی کہنے لگا بادشاہ سلامت کہاں میں گنہگار اور کہاں حضرت خضر علیہ السلام میں نے آپ سے جھوٹ بولا......میرے گھر کا خرچا پورا نہیں ہو رہا تھا بچے بھوک سے مر رہے تھے اس لیے ایسا کرنے پر مجبور ہوا......

سلطان محمود غزنوی نے اپنے اک وزیر کو کھڑا کیا اور پوچھا اس شخص کی سزا کیا ہے۔ وزیر نے کہا سر، اس شخص نے بادشاہ کے ساتھ جھوٹ بولا ہے۔ لہٰذا اس کا گلا کاٹ دیا جائے، دربار میں اک نورانی چہرے والے بزرگ بھی تشریف فرما تھے، کہنے لگے بادشاہ سلامت اس وزیر نے بالکل ٹھیک کہا......

بادشاہ نے دوسرے وزیر سے پوچھا آپ بتاؤ اس نے کہا بادشاہ سلامت۔ اس شخص نے بادشاہ کے ساتھ فراڈ کیا ہے اس کا گلا نہ کاٹا جائے بلکہ اسے کتوں کے آگے ڈالا جائے تاکہ یہ ذلیل ہو کر مرے۔ اسے مرنے میں کچھ وقت تو لگے۔ دربار میں بیٹھے اسی نورانی چہرے والے بزرگ نے کہا بادشاہ سلامت یہ وزیر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے......

سلطان محمود غزنوی نے اپنے پیارے غلام ایاز سے پوچھا تم کیا کہتے ہو؟ ایاز نے کہا بادشاہ سلامت آپ کی بادشاہی سے اک سال اک غریب کے بچے پلتے رہے آپ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اور نہ ہی اس کے جھوٹ سے آپ کی

شان میں کوئی فرق پڑا اگر میری بات مانیں، تو اسے معاف کردیں...... اگر اسے قتل کردیا تو اس کے بچے بھوک سے مرجائیں گے...... ایاز کی یہ بات سن کر محفل میں بیٹھا وہی نورانی چہرے والا بابا کہنے لگا...... ایاز بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے......

سلطان محمود غزنوی نے اس بابا جی کو بلایا اور پوچھا آپ نے ہر وزیر کے فیصلے کو درست کہا اس کی وجہ مجھے سمجھائی جائے...... بابا جی کہنے لگا بادشاہ سلامت پہلے نمبر پر جس وزیر نے کہا اس کا گلا کاٹا جائے وہ قوم کا قصائی ہے اور قصائی کا کام ہے گلے کاٹنا۔ اس نے اپنا خاندانی رنگ دکھایا۔ غلطی اس کی نہیں آپ کی ہے کہ آپ نے اک قصائی کو وزیر بنالیا......

دوسرا جس نے کہا اسے کتوں کے آگے ڈالا جائے۔ اُس وزیر کا والد بادشاہوں کے کتے نہلایا کرتا تھا کتوں سے شکار کھیلتا تھا اس کا کام ہی کتوں کا شکار ہے تو اس نے اپنے خاندان کا تعارف کرایا۔ آپ کی غلطی یہ کہ ایسے شخص کو وزارت دی جہاں ایسے لوگ وزیر ہوں وہاں لوگوں نے بھوک سے ہی مرنا ہے۔

اور تیسرا ایاز نے جو فیصلہ کیا تو سلطان محمود سنو ایاز سید زادہ ہے سید کی شان یہ ہے کہ سید اپنا سارا خاندان کربلا میں ذبح کرادیتا ہے مگر بدلا لینے کا کبھی نہیں سوچتا...... سلطان محمود اپنی کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے اور ایاز کو مخاطب کر کے کہتا ہے ایاز تم نے آج تک مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تم سید ہو......

ایاز کہتا ہے آج تک کسی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ ایاز سید ہے لیکن آج بابا جی نے میرا راز کھولا آج میں بھی ایک راز کھول دیتا ہوں۔ اے بادشاہ سلامت یہ بابا کوئی عام ہستی نہیں یہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔

☆......☆
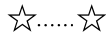
دوستی ہو تو ایسی

(سانول یار، سال دوم)

ایک دوست اپنے دوست کے جنازے کو دیکھ کر مسکرایا۔

ایک بزرگ بولا: بیٹا جوان جنازے پر مسکرایا نہیں کرتے۔ لڑکے نے آنکھیں صاف کیں اور بولا: کیا بتاؤں بابا دل تو خون کے آنسو رو رہا ہے۔

لیکن دوست سے وعدہ کیا تھا

جب بھی ملیں گے مسکراتے ہوئے ملیں گے

اور اس نے بھی کہا تھا

جب میں مرجاؤں مسکراتے ہوئے آنا

کیونکہ اس وقت تمھارے آنسو پونچھنے کے لیے میرے ہاتھ نہیں ہوں گے۔

غیر سیاسی پوسٹ

انتخا : ضمیر الحسن (سال دوم)

ایک مراثی بادشاہ کا عزیز ترین حجام تھا۔ یہ روزانہ بادشاہ کے پاس حاضر ہوتا تھا۔ اور دو تین گھنٹے اس کے ساتھ رہتا۔ اس دوران بادشاہ سلطنت کے امور بھی سرانجام دیتا رہتا، اور حجامت اور شیو بھی کرواتا رہتا تھا۔

ایک دن نائی نے بادشاہ سے عرض کیا، حضور میں وزیر کے مقابلے میں آپ سے زیادہ قریب ہوں۔ میں آپ کا وفادار بھی ہوں۔ آپ اس کی جگہ مجھے وزیر کیوں نہیں بنا دیتے۔

بادشاہ نے مسکرا کر حجام کی طرف دیکھا اور اس سے کہا۔

میں تمہیں وزیر بنانے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن تمہیں اس سے پہلے ٹیسٹ دینا ہوگا۔

نائی نے سینے پر ہاتھ باندھ کر کہا،

آپ حکم کیجیے۔

بادشاہ بولا۔ بندرگاہ پر ایک بحری جہاز آیا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں **معلومات** لا کر دو۔

نائی بھاگ کر بندرگاہ پر گیا۔ اور واپس آ کر بولا۔ جی جہاز وہاں کھڑا ہے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ یہ جہاز کب آیا؟ نائی دوبارہ سمندر کی طرف بھاگا، واپس آیا، اور بتایا، دو دن پہلے آیا۔

بادشاہ نے کہا۔ یہ بتاؤ یہ جہاز کہاں سے آیا؟ نائی تیسری بار سمندر کی طرف بھاگا، واپس آیا تو بادشاہ نے پوچھا جہاز پر کیا لدا ہے؟

نائی چوتھی بار سمندر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

قصہ مختصر۔ نائی شام تک سمندر اور محل کے چکر لگا لگا کر تھک گیا۔

اس کے بعد بادشاہ نے وزیر کو بلوایا اور اس سے پوچھا۔ کیا سمندر پر کوئی جہاز کھڑا ہے؟

وزیر نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

جناب دو دن پہلے ایک تجارتی جہاز اٹلی سے ہماری بندرگاہ پر آیا تھا۔ اس میں جانور، خوراک اور کپڑ الدا ہے۔ اس کے کپتان کا نام یہ ہے۔ یہ چھ ماہ میں یہاں پہنچا۔ یہ چار دن مزید یہاں ٹھہرے گا۔ یہاں سے ایران جائے گا۔ اور وہاں ایک ماہ رکے گا۔ اور اس میں دو سو نو لوگ سوار ہیں۔ اور میرا مشورہ ہے ہمیں بحری جہازوں پر ٹیکس بڑھا دینا چاہیے۔

بادشاہ نے یہ سن کر حجام کی طرف دیکھا۔

حجام نے چپ چاپ استرا اُٹھایا اور عرض کیا۔

''کلماں چھوٹیاں رکھاں کہ وڈیاں''

سردار داؤد اور کوچوان

معیز قدیر (سال دوم)

کہتے ہیں کہ افغانستان کے ایک سابق صدر سردار داؤد کو اطلاع ملی کہ کابل میں تانگے کا کرایہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

سردار داؤد نے فوراً عام لباس پہنا اور بھیس بدل کر ایک کوچوان کے پاس پہنچ کر پوچھا کہ

''محترم، پل چرخی (افغانستان کے ایک مشہور علاقے کا نام) تک کا کتنا کرایہ لوگے؟''

کوچوان نے سردار داؤد کو پہچانے بغیر جواب دیا کہ:

''میں سرکاری نرخ پر کام نہیں کرتا۔''

داؤد خان: 20؟

کوچوان: اور اوپر جاؤ۔

داؤد خان: 25؟

کوچوان: اور اوپر جاؤ۔

داؤد خان: 30؟

کوچوان: اور اوپر جاؤ۔

داؤد خان: 35؟

کوچوان: مارو تالی

داؤد خان تانگے پر سوار ہو گیا۔ تانگے والے نے داؤد خان کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ فوجی ہو؟

داؤد خان: اوپر جاؤ۔

کوچوان: اشتہاری ہو؟

داؤد خان: اور اوپر جاؤ۔

کوچوان: جنرل ہو؟

داؤدخان: اوراوپر جاؤ۔

کوچوان: مارشل ہو؟

داؤدخان: اوراوپر جاؤ۔

کوچوان: کہیں داؤدخان تو نہیں ہو؟

داؤدخان: مارو تالی۔

کوچوان کا رنگ اُڑ گیا۔

کوچوان نے داؤدخان سے کہا کہ مجھے جیل بھجو گے؟

داؤدخان: اوراوپر جاؤ۔

کوچوان: جلاوطن کرو گے؟

داؤدخان: اوراوپر جاؤ۔

کوچوان: پھانسی پر چڑھاؤ گے؟

داؤدخان: مارو تالی

اگر دو چار تالیاں ہمارے ملک میں بھی بج جائیں تو جہانگیر ترین، خسرو بختیار، نواز شریف، شہباز شریف، آصف علی زرداری اوپر گئے تو ملک میں کبھی کوئی کرپشن کا سوچے گا بھی نہیں۔ اب آپ بھی میری آواز سے آواز ملا کے ایک زبان کہو آمین اور

مارو تالی

☆......☆

جب نماز چھوٹ جانے لگے تو سوچو رب نے Unfriend تو نہیں کر دیا۔

فوراً Friend Request بھیجو اس سے پہلے کہ Blocked کر دیئے جاؤ۔

☆......☆

عبادت فرشتہ تو بنا سکتی ہے لیکن انسان نہیں بنا سکتی۔ انسان درد سے بنتا ہے۔ (واصف علی واصف)

☆......☆

مرد ہوس کا پجاری

بانو قدسیہ
انتخا : ندیم احمد سیال (لیکچرر ریاضی)

جب عورت مرتی ہے اس کا جنازہ مرد اٹھاتا ہے۔ اس کو لحد میں یہی مرد اتارتا ہے۔

پیدائش پر یہی مرد اس کے کان میں اذان دیتا ہے۔

باپ کے روپ میں سینے سے لگاتا ہے بھائی کے روپ میں تحفظ فراہم کرتا ہے اور شوہر کے روپ میں محبت دیتا ہے۔ اور بیٹے کی صورت میں اس کے قدموں میں اپنے لیے جنت تلاش کرتا ہے۔

واقعی بہت ہوس کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

ہوس بڑھتے بڑھتے ماں حاجرہ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے صفا و مروہ کے درمیان سعی تک لے جاتی ہے۔

اسی عورت کی پکار پر سندھ آ پہنچتا ہے۔

اسی عورت کی خاطر اندلس فتح کرتا ہے اور اسی ہوس کی خاطر 80% مقتولین عورت کی عصمت کی حفاظت کی خاطر موت کی نیند سو جاتے ہیں۔ واقعی ''مرد ہوس کا پجاری ہے۔''

لیکن جب حوا کی بیٹی کھلا بدن لیے، چست لباس پہنے باہر نکلتی ہے اور اس کو اپنے سحر میں مبتلا کر دیتی ہے تو یہ واقعی ہوس کا پجاری بن جاتا ہے۔

اور کیوں نا ہو؟

کھلا گوشت تو آخر کتے بلیوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔

جب عورت گھر سے باہر ہوس کے پجاریوں کا ایمان خراب کرنے نکلتی ہے۔ تو روکنے پر یہ آزاد خیال عورت مرد کو ''تنگ نظر'' اور ''پتھر کے زمانہ کا'' جیسے القابات سے نواز دیتی ہے کہ کھلے گوشت کی حفاظت نہیں کتوں بلوں کے منہ سینے چاہیے ہیں۔

ستر ہزار کا سیل فون ہاتھ میں لے کر تنگ شرٹ کے ساتھ پھٹی ہوئی جینز پہن کر ساڑھے چار ہزار کا میک اپ چہرے پر لگا کر کھلے بالوں کو شانوں پر گرا کر انڈے کی شکل جیسا چشمہ لگا کر کھلے بال جب لڑکیاں گھر سے باہر نکل کر مرد کی ہوس بھری

نظروں کی شکایت کریں تو ان کو توپ کے آگے باندھ کر اُڑا دینا چاہیے جو سیدھا یورپ و امریکہ میں جا گریں اور اپنے جیسی عورتوں کی حالت زار دیکھیں جن کی عزت صرف بستر کی حد تک محدود ہے۔

سنبھال اے بنت حوا اپنے شوخ مزاج کو
ہم نے سرِ بازار حسن کو نیلام ہوتے دیکھا ہے

مرد

میں نے مرد کی بے بسی تب محسوس کی جب میرے والد کینسر سے جنگ لڑ رہے تھے اور انھیں صحت یاب ہونے سے زیادہ اس بات کی فکر لاحق تھی کہ جو کچھ انھوں نے اپنے بچوں کے لیے بچایا تھا وہ ان کی بیماری پر خرچ ہو رہا ہے اور ان کے بعد ہمارا کیا ہوگا؟ میں نے مرد کی قربانی تب دیکھی جب ایک بازار عید کی شاپنگ کرنے گئی اور ایک فیملی کو دیکھا جن کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز کا ڈھیر تھا اور بیوی شوہر سے کہہ رہی تھی کہ میری اور بچوں کی خریداری پوری ہوگئی، تم دیکھ لو اور کیا لینا ہے بعد میں اکیلے آ کر اس رش میں کچھ نہیں لے پاؤں گی۔ ابھی میں ساتھ ہوں جو خریدنا ہے آج ہی خرید لو۔

میں نے مرد کا ایثار تب محسوس کیا جب وہ اپنی بیوی بچوں کے لیے کچھ لایا تو اپنی ماں اور بہن کے لیے بھی تحفہ لایا، میں نے مرد کا تحفظ تب دیکھا جب سڑک کراس کرتے وقت اس نے اپنے ساتھ چلنے والی فیملی کو اپنے پیچھے کرتے ہوئے خود کو ٹریفک کے سامنے رکھا۔ میں نے مرد کا ضبط تب دیکھا جب اس کی جوان بیٹی گھر اجڑنے پر واپس لوٹی تو اس نے غم کو چھپاتے ہوئے بیٹی کو سینے سے لگایا اور کہا کہ ابھی میں زندہ ہوں لیکن اس کی کھنچتی ہوئی کنپٹیاں اور سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ڈھیر تو وہ بھی ہو چکا، رونا تو وہ بھی چاہتا ہے لیکن یہ جملہ کہ مرد کبھی روتا نہیں ہے اسے رونے نہیں دے گا۔

چنگیز خان کا شکاری عقاب

انتخا : محمد سلمان (سال دوم)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ منگول بادشاہ چنگیز خان اپنے کچھ خاص ساتھیوں کے ہمراہ شکار پر روانہ ہوا۔ ساتھیوں کے پاس تیر کمان تھے۔ جبکہ چنگیز خان کے پاس اُس کا پسندیدہ عقاب تھا جو اُس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ عقاب یقیناً تیر کمان سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ اُسے ہوا میں چھوڑ دیا جائے تو وہ بلند ہو کر ماحول کا جائزہ لے سکتا ہے، چھپے ہوئے یا دور موجود شکار کو آسانی دیکھ سکتا ہے۔ آپ اِسے آٹومیٹک ڈرون کیمرہ سمجھ لیں۔

چنگیز خان اور ساتھی دن کا بیشتر حصہ شکار ڈھونڈتے رہے مگر اُنہیں کچھ نہ ملا۔ آخر کار تنگ آ کر وہ سب اپنی خیمہ بستی میں واپس آ گئے۔ کچھ دیر بعد چنگیز خان اپنے عقاب کو ہمراہ لے کر کسی کو بتائے بغیر اکیلا نکل گیا۔ اصل میں وہ کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اگر نہ نکل جاتا تو اپنا غصہ ساتھیوں پر نکال دیتا۔ وہ سب جنگل میں ضرورت سے زیادہ دیر قیام پذیر ہو چکے تھے۔

تو چنگیز خان اکیلا نکل گیا تھا۔ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ چشمے دریا وغیرہ سب سوکھے پڑے تھے۔ وہ پیاس کی شدت سے نڈھال ہو گیا۔ بہت دیر بعد اُس نے اپنے سامنے ایک چٹان میں سے پانی کی ہلکی سی دھار ٹپکتی دیکھی۔ اُس نے اپنے پیالہ کو بھرنے کے لیے سب سے پہلے عقاب کا نقاب اُتار کر اُسے آزاد کر دیا۔ تب پیالہ کو دھار کے نیچے لے جا کر بھرنے کا انتظار کرنے لگا۔

ابھی پیالہ بس بھرنے کو ہی تھا کہ عقاب کو جانے کیا ہوا۔ اُس نے جُست لگائی اور پیالے پر جھپٹا مار کر گرا دیا۔ سارا پانی زمین پر گر کر مٹی میں جذب ہو گیا۔ چنگیز خان کو عقاب پر سخت غصہ آیا مگر آخر وہ اس کا پسندیدہ عقاب تھا اس لیے برداشت کر گیا۔ اُس نے پیالہ کو زمین سے اُٹھا کر ایک بار پھر دھار کے نیچے کر دیا۔ پیالہ پھر بھرنا شروع ہوا۔

ابھی پیالہ آدھا بھرا تھا کہ عقاب نے پھر حملہ کر کے پیالہ گرا دیا۔ چنگیز خان نے سوچا کہ بے شک یہ عقاب میرا پسندیدہ ہے مگر کسی کو ہتک عزت یا ناقدری کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص دور سے یہ سارا منظر دیکھ رہا ہو اور بعد میں فوج اور رعایا میں مشہور کر دے کہ تمہارا بادشاہ تو ایک عقاب کو بھی نہیں سدھار سکا، تمہارا خیال کیا رکھے گا۔ یہی سوچ کو اُس نے تلوار نکال لی۔

ایک بار پھر پیالہ ابھی بھر ہی رہا تھا کہ عقاب حملہ کرنے لگا۔ چنگیز خان نے ایک ہی ضرب سے عقاب کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اتنی دیر میں پانی کی دھار رُک چکی تھی۔ چنگیز خان نے چٹان پر قدم رکھا اور کچھ ہی دیر میں اوپر پانی کے منبع تک پہنچ گیا۔ اوپر پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کے اندر علاقے کا زہریلا ترین سانپ مرا پڑا تھا اور اُس کا جسم پانی میں گھل رہا تھا۔ چنگیز خان کو معلوم ہو گیا کہ اگر وہ پانی پی لیتا تو وہ بھی مر جاتا۔

چنگیز خان کو مقتول عقاب پر بہت حیرت ہوئی جو اسی لیے پانی نہیں پینے دے رہا تھا۔ اُس نے مرے ہوئے عقاب کو اُٹھایا اور واپس خیمہ بستی میں آ گیا۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ چنگیز خان نے اپنے عقاب کی شبیہ کے مطابق سونے کا عقاب بنوایا۔ آج بھی مجسموں، تصویروں، تحریروں اور شاعری میں اُس عقاب کا ذکر ملتا ہے۔

چنگیز خان نے سونے کے عقاب کے ایک پَر پہ لکھوایا:

''اگر تمہارا دوست کوئی ایسا کام کر دے جو تمہیں پسند نہ ہو، وہ پھر بھی تمہارا دوست رہے گا۔''

دوسرے پَر پہ لکھوایا:

''جو بھی کام غصّہ کی حالت میں کیا جائے، وہ کام تمہارے لیے باعثِ پشیمانی اور بے ثمر ہوگا۔''
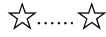
عادتیں نسلوں کا پتہ دیتی ہیں

انتخا : حافظ رضوان احمد
(لیکچرر معاشیات)

ایک بادشاہ کے دربار میں ایک اجنبی نوکری کی طلب لیے حاضر ہوا،
قابلیت پوچھی گئی: کہا! سیاسی ہوں ....
(عربی میں سیاسی، افہام وتفہیم سے مسئلہ حل کرنے والے معاملہ فہم کو کہتے ہیں)
بادشاہ کے پاس سیاست دانوں کی بھرمار تھی،
اسے خاص ''گھوڑوں کے اصطبل کا انچارج'' بنالیا۔
جو حال ہی میں فوت ہو چکا تھا۔
چند دن بعد، بادشاہ نے اس سے اپنے سب سے مہنگے اور عزیز گھوڑے کے متعلق دریافت کیا،
اس نے کہا ''نسلی نہیں ہے۔''
بادشاہ کو تعجب ہوا، اس نے جنگل سے سائیں کو بلا کر دریافت کیا......
اس نے بتایا، گھوڑا نسلی ہے لیکن اس کی پیدائش پر اس کی ماں مر گئی تھی۔ یہ ایک گائے کا دودھ پی کر اس کے ساتھ پلا ہے۔
مسئول کو بلایا گیا،
تم کو کیسے پتا چلا، اصیل نہیں ہے؟؟؟
اس نے کہا،
جب یہ گھاس کھاتا ہے تو گائے کی طرح سر نیچے کر کے
جبکہ نسلی گھوڑا گھاس منہ میں لے کر سر اٹھا لیتا ہے
بادشاہ اس کی فراست سے بہت متاثر ہوا،
مسئول کے گھر اناج، گھی، بھنے دنبے اور پرندوں کا اعلیٰ گوشت بطور انعام بھجوایا۔
اس کے ساتھ ساتھ اسے ملکہ کے محل میں تعینات کر دیا،
چند دنوں بعد بادشاہ نے مصاحب سے بیگم کے بارے رائے مانگی،
اس نے کہا۔

طورواطوار تو ملکہ جیسے ہیں لیکن ''شہزادی نہیں ہے''۔

بادشاہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، حواس بحال کیے، ساس کو بلا بھیجا

معاملہ اس کے گوش گزار کیا، اس نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ تمہارے باپ نے میرے خاوند سے ہماری بیٹی کی پیدائش پر ہی رشتہ مانگ لیا تھا لیکن ہماری بیٹی 6 ماہ ہی میں فوت ہوگئی تھی۔

چنانچہ ہم نے تمہاری بادشاہت سے قریبی تعلقات قائم کرنے کے لیے کسی کی بچی کو اپنی بیٹی بنالیا۔

بادشاہ نے مصاحب سے دریافت کیا، ''تم کو کیسے علم ہوا''۔

اس نے کہا، اس کا ''خادموں کے ساتھ سلوک'' جاہلوں سے بدتر ہے۔

بادشاہ اس کی فراست سے خاصا متاثر ہوا۔ ''بہت سا اناج، بھیڑ بکریاں'' بطور انعام دیں۔

ساتھ ہی اسے اپنے دربار میں متعین کر دیا۔

کچھ وقت گزرا،

''مصاحب کو بلایا''

''اپنے بارے دریافت کیا'' مصاحب نے کہا، جان کی امان،

بادشاہ نے وعدہ کیا، اس نے کہا:

''نہ تو تم بادشاہ زادے ہو نہ تمہارا چلن بادشاہوں والا ہے۔''

بادشاہ کو تاؤ آیا مگر جان کی امان دے چکا تھا،

سیدھا والدہ کے محل پہنچا، ''والدہ نے کہا یہ سچ ہے''۔

تم ایک چرواہے کے بیٹے ہو، ہماری اولاد نہیں تھی تو تمہیں لے کر پالا۔

بادشاہ نے مصاحب کو بلایا پوچھا، بتا،

''تجھے کیسے علم ہوا''؟؟؟

اس نے کہا

''بادشاہ'' جب کسی کو ''انعام واکرام'' دیا کرتے ہیں تو ''ہیرے موتی جواہرات'' کی شکل میں دیتے ہیں،،،

لیکن آپ ''بھیڑ، بکریاں، کھانے پینے کی چیزیں'' عنایت کرتے ہیں۔

''یہ اسلوب بادشاہ زادے کا نہیں۔''

کسی چرواہے کے بیٹے کا ہی ہوسکتا ہے۔

عادتیں نسلوں کا پتہ دیتی ہیں............

عادات، اخلاق اور طرز عمل............ خون اور نسل دونوں کی پہچان کرا دیتے ہیں۔

ہمیں کب خاموش رہنا چاہیے!!!

انتخا : محمد اسامہ (سال دوم)

- ☆ خاموش رہیے، جب آپ غصے میں ہوں۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ کے پاس دلائل نہ ہوں۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ نے کسی بات کی تحقیق نہیں کی ہو۔
- ☆ خاموش رہیے، جب سننے اور سیکھنے کا وقت ہو۔
- ☆ خاموش رہیے، جب کوئی گناہ کی بات کو لے کر مذاق کرنے لگیں۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ کی باتوں کا غلط مفہوم لیا جانے لگے۔
- ☆ خاموش رہیے، جب دوسرے اپنے معاملات طے کر رہے ہوں۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ کا بولنا کسی کی دوستی توڑنے کا سبب بننے لگیں۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ کسی پر تنقید کرنے لگیں۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ بات کو پرخلوص طریقے سے نہ کہہ سکیں۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ کو کچھ بول کر پچھتانا پڑے۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ کسی بات کو کئی بار کہہ چکے ہوں۔
- ☆ خاموش رہیے، جب آپ کے الفاظ کسی کے لیے ناگوار بن جائیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

من صَمَتَ نَجَا

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص خاموش رہا اس نے نجات پائی۔''

تو نجات کے لیے کچھ جگہوں پر خاموش رہنا بہتر ہے۔

☆......☆

حضرت عثمان بن عفانؓ

انتخا : حافظ عمر شہزاد (سال دوم)

سعودی عرب کے ایک بینک میں خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آج بھی کرنٹ اکاؤنٹ ہے اور مدینہ منورہ کی میونسپلٹی میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام پر باقاعدہ جائیداد رجسٹرڈ ہے اور آج بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر بجلی اور پانی کا بل آتا ہے۔

نبوت کے تیرہویں سال میں جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں پینے کے پانی کی بہت قلت تھی۔ مدینہ منورہ میں ایک یہودی کا کنواں تھا جو مسلمانوں کو پانی مہنگے داموں فروخت کرتا۔ اس کنویں کا نام ''بئر رومہ'' یعنی رومہ کا کنواں تھا۔

وہاں ان حالات سے پریشان ہو کر مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ''کون ہے جو یہ کنواں خریدے اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دے......؟ ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ اسے جنت میں چشمہ عطا کرے گا۔''

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اس یہودی کے پاس گئے اور کنواں خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ کنواں چونکہ منافع بخش آمدنی کا ذریعہ تھا اس لیے یہودی نے اسے فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ تدبیر کی کہ یہودی سے کہا ''پورا کنواں نہ سہی......آدھا کنواں مجھے فروخت کر دو...... آدھا کنواں فروخت کرنے پر ایک دن کنویں کا پانی تمہارا ہوگا اور دوسرے دن میرا ہوگا......''

یہودی ان کی اس پیشکش پر لالچ میں آ گیا......اس نے سوچا کہ حضرت عثمان اپنے دن میں پانی مہنگے داموں فروخت کریں گے......اس طرح اسے زیادہ منافع کمانے کا موقع مل جائے گا......

چنانچہ اس نے آدھا کنواں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فروخت کر دیا......

سیدنا عثمان علی رضی اللہ عنہ نے وہ کنواں اللہ کی رضا کے لیے وقف کر کے اپنے دن مسلمانوں کو کنویں سے مفت پانی حاصل کرنے کی اجازت دے دی......لوگ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دن مفت پانی حاصل کرنے اور اگلے دن کے لیے بھی ذخیرہ کر لیتے۔ یہودی کے دن کوئی بھی شخص پانی خریدنے نہ جاتا۔

یہودی نے دیکھا کہ اس کی تجارت ماند پڑ گئی ہے تو اس نے حضرت عثمان سے باقی آدھا کنواں بھی خریدنے کی پیشکش کر دی۔

اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ راضی ہو گئے اور کم وبیش پینتیس ہزار درہم میں پورا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے

وقف کر دیا۔

اس دوران ایک مالدار آدمی نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کنواں دوگنا قیمت پر خریدنے کی پیش کش کی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''مجھے اس سے کہیں زیادہ کی پیش کش ہے......''

اس شخص نے کہا ''میں تین گنا دوں گا......''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''مجھے اس سے بھی کئی گنا زیادہ کی پیش کش ہے۔''

اس آدمی نے کہا میں چار گنا دوں گا......حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''مجھے اس سے بھی کہیں زیادہ کی پیش کش ہے۔''

اس طرح وہ شخص رقم بڑھاتا گیا اور حضرت عثمان یہی جواب دیتے رہے۔

یہاں تک کہ اس آدمی نے کہا کہ ''حضرت آخر کون ہے جو آپ کو دس گنا دینے کی پیش کش کر رہا ہے۔''

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''میرا رب مجھے ایک نیکی پر دس گنا اجر دینے کی پیش کش کرتا ہے۔''

وقت گزرتا گیا اور یہ کنواں مسلمانوں کو سیراب کرتا رہا یہاں تک کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس کنویں کے اردگرد کھجوروں کا باغ بن گیا اور اسی دور میں ہی اس باغ کی دیکھ بھال ہوئی۔

بعدازاں آلِ سعود کے عہد میں اس باغ میں کھجور کے درختوں کی تعداد تقریباً پندرہ سو پچاس ہوگئی۔

حکومت وقت نے اس باغ کے گرد چاردیواری بنوائی اور یہ جگہ میونسپلٹی میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام پر رجسٹرڈ کر دی۔

وزارتِ زراعت یہاں کی کھجوریں بازار میں فروخت کرتی اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام پر بینک میں جمع کرواتی رہی۔ چلتے چلتے یہاں تک اس اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہوگئی کہ مدینہ منورہ کے مرکزی علاقہ میں اس باغ کی آمدنی سے ایک کشادہ پلاٹ لیا گیا جہاں فندق عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے ایک رہائشی ہوٹل تعمیر کیا جانے لگا۔

اس رہائشی ہوٹل سے سالانہ پچاس ملین ریال آمدنی متوقع ہے۔ جس کا آدھا حصہ غریبوں اور مسکینوں کی کفالت اور باقی آدھا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہوگا۔

ذوالنورین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے اس عمل اور خلوصِ نیت کو اللہ رب العزت نے اپنی بارگاہ میں ایسے قبول فرمایا اور اس میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ قیامت تک ان کے لیے صدقہ جاریہ بنا دیا۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کی جانیں اور مال اللہ تعالیٰ نے اپنی جنتوں کے بدلے خرید لیے۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ تجارت کی۔ جنہوں نے اللہ عزوجل کو قرض دیا اچھا قرض اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں کئی گنا بڑھا کر لوٹایا۔

اپنی نسلوں کو لعنت سکول سے بچاؤ

انتخاب: ذوہیب حسن
(ایم اے اسلامیات)

یہ چھٹی یا ساتویں جماعت کا کمرہ تھا اور میں کسی اور ٹیچر کی جگہ کلاس لینے چلا گیا۔ تھکن کے باوجود کامیابی کے موضوع پر طلبا کو لیکچر دیا اور پھر ہر ایک سے سوال کیا

ہاں جی تم نے کیا بننا ہے؟

ہاں جی آپ کیا بنو گے؟

ہاں جی آپ کا کیا ارادہ ہے، کیا منزل ہے؟

سب طلبا کے ملتے جلتے جواب۔

ڈاکٹر

انجینئر

پولیس

فوجی

بزنس مین

لیکن ایسے لیکچر کے بعد یہ میرا روٹین کا سوال تھا اور بچوں کے روٹین کے جواب۔ جن کو سننا کانوں کو بھلا اور دل کو خوشگوار لگتا تھا لیکن ایک جواب آج بھی دوبارہ سننے کو نا ملا۔ کان تو اس کو سننے کے متلاشی تھے ہی مگر روح بھی بے چین تھی۔

عینک لگائے بیٹھا خاموش گم سم بچہ جس کو میں نے بلند آواز سے پکار کر اس کی سوچوں کا تسلسل توڑا۔

ہیلو ارے میرے شہزادے آپ نے کیا بننا ہے۔ آپ بھی بتا دو۔ کیا آپ سر تبسم سے ناراض ہیں؟

بچہ آہستہ سے کھڑا ہوا اور کہا سر میں نورالدین زنگی بنوں گا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور کلاس کے دیگر بچے ہنسنے لگے۔ اس کی آواز گویا میرا کلیجہ چیر گئی ہو۔ روح میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

پھر پوچھا بیٹا آپ کیا بنو گے سر میں نورالدین زنگی بادشاہ بنوں گا۔ اِدھر اس کا جواب دینا تھا ادھر میری روح بے چین ہوگئی۔ جیسے اسی جذبے کی اسی آواز کی تلاش میں اس شعبہ تدریس کو اپنایا ہو۔

بیٹا آپ ڈاکٹر، فوجی یا انجینئر کیوں نہیں بنو گے؟

سر امی نے بتایا ہے کہ اگر میں نورالدین زندگی بنوں گا تو مجھے نبی پاک ﷺ کا دیدار ہوگا جو لوگ ڈنمارک میں ہمارے پیارے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کر رہے ہیں ان کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس بچے کی آواز بلند اور لہجے میں سختی آ رہی تھی۔

اس کی باتیں سن کر میرا جسم پسینہ میں شرابور ہوگیا۔ ادھر کلاس کے اختتام کی گھنٹی بجی اور میں روتا ہوا باہر آیا۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آج ماؤں نے نورالدین زنگی پیدا کرنے چھوڑ دیے ہیں اور اساتذہ نے نورالدین زنگی بنانا چھوڑ دیے ہیں۔ میں اس دن سے آج تا دم تحریر اپنے طلبا میں پھر سے وہ نورالدین زنگی تلاش کر رہا ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں وہ کون ہے۔ اس ماں نے اپنے بیٹے کو کس نورالدین زنگی کا تعارف کروایا ہوگا یہ واقعہ پڑھیے اور اپنے بچوں میں سے ایک عدد نورالدین زنگی قوم کو دیجیے۔

ایک رات سلطان نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ عشاء کی نماز پڑھ کر سوئے کہ اچانک اٹھ بیٹھے اور نم آنکھوں سے فرمایا میرے ہوتے ہوئے میرے آقا دو عالم ﷺ کو کون ستا رہا ہے۔

آپ اس خواب کے بارے میں سوچ رہے تھے جو مسلسل تین دن سے انہیں آ رہا تھا اور آج پھر چند لمحوں پہلے انھیں آیا جس میں سرکاری دو عالم نے دو افراد کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ مجھے ستا رہے ہیں۔

اب سلطان کو قرار کہاں تھا انہوں نے چند ساتھی اور سپاہی لے کر دمشق سے مدینہ جانے کا ارادہ فرمایا۔

اس وقت دمشق سے مدینہ کا راستہ ۲۰ سے ۲۵ دن کا تھا مگر آپ نے بغیر آرام کیے یہ راستہ ۱۶ دن میں طے کیا۔ مدینہ پہنچ کر آپ نے مدینہ آنے اور جانے کے تمام راستے بند کروائے اور تمام خاص و عام کو اپنے ساتھ کھانے پر بلایا۔

سب لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے، آپ ہر چہرہ دیکھتے مگر آپ کو وہ چہرے نظر نہ آئے اب سلطان کو فکر لاحق ہوئی اور آپ نے مدینے کے حکم سے فرمایا کہ کوئی ایسا ہے جو اس دعوت میں شریک نہیں۔

جواب ملا کہ مدینے میں رہنے والوں میں سے تو کوئی نہیں مگر دو مغربی زائر ہیں جو روضہ رسول کے قریب ایک مکان میں رہتے ہیں، تمام دن عبادت کرتے ہیں اور شام کو جنت البقیع میں لوگوں کو پانی پلاتے ہیں، جو عرصہ دراز سے مدینہ میں مقیم ہیں۔

سلطان نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ دونوں زائر بظاہر بہت عبادت گزار لگتے تھے۔

ان کے گھر میں تھا ہی کیا ایک چٹائی اور دو چار ضرورت کی اشیاء کہ یکدم سلطان کو چٹائی کے نیچے کا فرش لرزتا محسوس ہوا۔ آپ نے چٹائی ہٹا کے دیکھا تو وہاں ایک سرنگ تھی۔

آپ نے اپنے سپاہی کو سرنگ میں اترنے کا حکم دیا وہ سرنگ میں داخل ہوئے اور واپس آ کر بتایا کہ یہ سرنگ نبی پاک ﷺ کی قبر مبارک کی طرف جاتی ہے۔

یہ سن کر سلطان کے چہرے پر غیظ وغضب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ نے دونوں زائرین سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟

حیل وحجت کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ یہودی ہیں اور اپنے قوم کی طرف سے تمہارے پیغمبر کے جسم اقدس کو چوری کرنے پر مامور کیے گئے ہیں۔ سلطان یہ سن کر رونے لگے،

اسی وقت ان دونوں کی گردنیں اڑا دی گئیں۔ سلطان روتے جاتے اور فرماتے جاتے کہ

''میرا نصیب کہ پوری دنیا میں سے اس خدمت کے لیے اس غلام کو چنا گیا۔''

اس ناپاک سازش کے بعد ضروری تھا کہ ایسی تمام سازشوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کیا جائے۔ سلطان نے معمار بلائے اور قبر اقدس کے چاروں طرف خندق کھونے کا حکم دیا یہاں تک کہ پانی نکل آئے۔ سلطان کے حکم سے اس خندق میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا گیا۔

بعض کے نزدیک سلطان کو سرنگ میں داخل ہو کر قبر انور پر حاضر ہو کر قدمین شریفین کو چومنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔
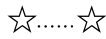
اللہ بندے کو سزا کیوں دیتا ہے؟

انتخاب : عذیر حسن (سال دوم)

اللہ اپنے بندے کو سزا کیوں دیتا ہے؟

مجھے اس سوال کا ایسا جواب ملا کہ آج تک مطمئن ہوں!

ہمارے ویٹنری ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر ہوا کرتے تھے۔ میرے اُن سے اچھے مراسم تھے۔ یہ یونیورسٹی میں میرا تیسرا سال تھا۔ ایک دفعہ میں ان کے دفتر گیا۔ مجھ سے کہنے لگے: ایک مزے کی بات سناؤں تمہیں؟

جی سر ضرور!

پچھلے ہفتے کی بات ہے میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔

اچانک ایک غیر معمولی نمبر سے مجھے کال آئی: ''پندرہ منٹ کے اندر اندر اپنی سراؤنڈنگز کی کلیئرنس دیں!''

ٹھیک پندرہ منٹ بعد پانچ بکتر بند گاڑیاں گھوم کے میری آفس کے اطراف میں آ کر رکیں۔

سول وردی میں ملبوس حساس اداروں کے لوگ دفتر میں آئے۔ ایک آفیسر آگے بڑھا:

''امریکہ کی سفیر آئی ہے ان کے کتے کو پرابلم ہے۔ اس کا علاج کریئے۔ تھوڑی دیر بعد اک عورت آئی، ان کے ساتھ ایک اعلیٰ نسل کا کتا بھی تھا۔

کہنے لگیں، میرے کتے کے ساتھ عجیب وغریب مسئلہ ہے۔ میرا کتا نافرمان ہو گیا ہے۔ اسے میں پاس بلاتی ہوں یہ دور بھاگ جاتا ہے۔ خدارا کچھ کریں یہ مجھے بہت عزیز ہے اس کی بے اعتنائی مجھ سے سہی نہیں جاتی!!

میں نے کتے کو غور سے دیکھا، پندرہ منٹ جائزہ لینے کے بعد میں نے کہا: میم! یہ کتا ایک رات کے لیے میرے پاس چھوڑ دیں میں اس کا جائزہ لے کے حل کرتا ہوں، اس نے بے دلی سے حامی بھر لی۔

سب چلے گئے تو میں نے فیضو کمدار کو آواز لگائی اور اسے بولا: اس کو بھینسوں والے باڑے میں باندھ اور اسے ہر آدھے گھنٹے بعد چمڑے کے لتر مارنا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد صرف پانی ڈالنا، جب پانی پی لے تو پھر لتر مارنا۔

کمدار جٹ آدمی تھا۔ سارے رات کتے کے ساتھ لتر ٹریٹ منٹ کرتا رہا!

صبح کو سفیر، پورا عملہ لیے میرے آفس میں آ دھمکی!

Doctor, what about my pup?

I said: Hope your puppy has missed you too!!

کمدار کتے کو لے کر آیا!

جونہی کتا کمرے کے دروازے میں آیا چھلانگ لگا کے سفیر کی گود میں آ بیٹھا، لگا دم ہلانے اور ان کا منہ چاٹنے لگا!

کتا مڑ مڑ تشکر آمیز نگاہوں سے مجھے تکتا رہا اور میں گردن ہلا ہلا کے مسکراتا رہا۔

سفیر کہنے لگی: سر آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا کہ اچانک اس کا یہ حال ہے؟

میں نے کہا: ریشم واطلس، ائیر کنڈیشن روم، اعلیٰ پائے کی خوراک کھا کھا کے یہ خود کو مالک سمجھ بیٹھا تھا اور اپنے مالک کی پہچان بھول گیا تھا۔ بس اس کا یہ خناس اُتارنے کے لیے اس کو ذرا سا سائیکولوجیکل پلس فزیکل ٹریٹمنٹ کی اشد ضرورت تھی، وہ دے دی...... ناؤ ہی از او کے!

اللہ بندے کو سزا کیوں دیتا ہے؟

مجھے اس سوال کا ایسا جواب ملا کہ آج تک مطمئن ہوں!!

دہشت

انتخا :محمد تیمور خان

عید کا دن تھا چاول پکا رہی تھی کہ اچانک اس میں سانپ آ گرا۔ ساس کے ڈر سے چاول گرانے کی بجائے سانپ کو بھی اس میں پکا دیا۔ سب نے بہت تعریف کی کہ بہترین چاول پکائے بہت مزہ آیا، سال گزرا ایک اور موقع پر چاول پکائے۔ سب نے ایک ہی بات کی پچھلی عید پہ جو چاول پکے تھے کمال کا ذائقہ تھا۔ اب ساس کا جلال کچھ مدھم پڑ چکا تھا اور عورت راز کا بوجھ بھی کب تک اٹھائے پھرتی، سو بتا ہی دیا کہ اس میں سانپ گرا تھا جسے میں نے اس میں پکا دیا تھا۔

یہ سننا تھا کہ سب گھر والے بے ہوش

ایک کو دل کا دورہ پڑا اور وہیں مر گیا

اب یہ اثر سانپ کے زہر کا تھا یا سانپ کے خوف کا؟

آ گے چلیں

امریکہ میں موت کے سزا یافتہ ایک قیدی پر ایک عجیب تجربہ کیا گیا، اسے بتایا گیا کہ آپ کو نہ پھانسی دی جائے گی نہ گولی ماری جائے گی نہ ہی زہر کا انجیکشن بلکہ سانپ سے ڈسوایا جائے گا۔ اس کے خیالات پر سانپ چھا گیا پھر سانپ اس کے سامنے لایا گیا اسے یقین ہو گیا کہ اس سانپ نے مجھے ڈسنا ہے۔ پھر اس کی آنکھوں پر ایک پٹی باندھی گئی اور دو کامن پنیں اسے چبھوئی گئیں جس سے اسے پکا یقین ہو گیا کہ سانپ نے ڈس لیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے خون کے ٹیسٹ ہوئے تو خون میں سانپ کا زہر موجود تھا۔ اب اس شخص کو سانپ نے چھوا تک نہیں لیکن اس کے باوجود اس کی موت بھی واقع ہوئی اور خون میں سانپ کا زہر بھی پایا گیا۔ یہ کیا تھا؟ خوف

یقین جانیے

آج جتنی اموات ہو رہی ہیں اس میں 80 فیصد خوف کے زیر اثر ہو رہی ہیں اور اس قتل میں ہر وہ شخص برابر کا شریک ہے جو خوف پھیلا رہا ہے اس لیے احتیاط کی ترغیب دیجئے، آگاہی عام کیجیے لیکن دہشت نہ پھیلائیں۔ حوصلہ دیجئے۔

شخصیات

ایک پروفیسر کی سبکدوش ہونے تک کی خودنوشت

پروفیسر عبدالرحمٰن قاصرؔ (مرحوم)

(ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا)۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ کا

ابتدائی حالات

میں 29 اکتوبر 1939ء اتوار کو جلالپور بھٹیاں ضلع حافظ آباد (سابقہ تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ) میں تولد ہوا۔ والد محترم کا اسم گرامی حضرت میاں نبی بخش ایمن آبادی اور والدہ محترمہ کا اسم محترمہ ماہ تاب بی بی تھا۔ بلحاظ ذات جاٹ پھلروان قبیلے سے تعلق تھا۔ والد صاحب کسب معاش کے لیے اپنے چھوٹے بھائی میاں اللہ دتہ کے ہمراہ اپنے والد صاحب میاں محمد وزیر خاں، جوان دنوں تحصیل وزیر آباد سے بطور تحصیل پیادہ (تعمیل کنندہ) تبدیل ہو کر تحصیل حافظ آباد میں تعینات ہوئے تھے، اپنے دونوں بیٹیوں کو جہلم میں ایک ماہر خیّاط کی تربیت میں دے چکے تھے باپ کے حکم پر 1909ء میں جلال پور بھٹیاں فروکش ہوئے۔ دونوں بھائی ماہر خیّاط (Tailor) تھے اور بہت محنتی، دیانتدار، متقی اور پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ والد صاحب نے میری گُھٹی کے لیے اپنے بہترین مخلص، متدیّن، عالمِ باعمل اور خطیب جناب حضرت مولانا قاضی غلام نبی اصغر کو جلال پور کہنہ پیغام بھیجا تو وہ کشاں کشاں تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے دست مبارک سے گُڑ اپنے منہ کے لعاب سے ملا کر میرے منہ میں ڈال کر گھٹی دی اور میرا نام عبدالرحمٰن رکھا اور دعائے خیر و برکت مانگی۔ میں جسمانی طور پر بہت لاغر تھا اس لیے گائے کا دودھ لازمی تھا۔ چنانچہ دودھ کے لیے والد صاحب کے ہندو دوست رائے صاحب ڈاکٹر آیارام نے اپنی گائے کا دودھ بھیجنے کا ذمہ لیا۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچا تو دینی تعلیم کے لیے محلے کی مسجد کے امام جناب میاں محمد صادق انصاری کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ 9 سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید پڑھ لیا تھا۔

سکول کی تعلیم

پانچ سال کی عمر میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ سکول کی تعلیم کے لیے مجھے مقامی ڈسٹرکٹ بورڈ اینگلو ورینکلر مڈل سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ جماعت اول کے استاد ماسٹر دینا ناتھ ہندو ٹیچر تھے۔ وہ اپنے شاگردوں پر سکول اور سکول اوقات کے بعد کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ کسی بچے کو سکول سے غیر حاضر رہنے یا سکول کے اوقات کے بعد آوارہ گردی کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ سکول اوقات کے بعد مجھے مصروف رکھنے کے لیے استاد صاحب نے میرے والد صاحب کی دکان پر اُردو حروف تہجی اور اُردو

گنتی دس تک کا چارٹ لٹکا دیا تھا جس کو میں دیکھ کر تختی لکھا کرتا تھا۔ استاد صاحب بازار میں آتے جاتے میری تختی کی درستی کر دیا کرتے۔ میں نے قصبہ میں پاکستان کے قیام کی تقریب کا منظر دیکھا اور شرکت بھی کی۔ چوتھی جماعت تک پرائمری تعلیم ہوا کرتی تھی اور اس جماعت کا سنٹر امتحان اے ڈی آئی (اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر) سکولز تحصیل حافظ آباد لیا کرتے تھے اس لیے چوتھی جماعت کے استاد صاحب سکول اوقات کے بعد بھی تمام جماعت کو دن اور رات بلا معاوضہ زائد وقت بھی دیا کرتے تھے۔ سنٹر کے امتحان میں ساری جماعت کامیاب ہوگئی۔ اب میں حصہ مڈل میں پانچویں جماعت میں داخل ہو گیا اور اُردو، ریاضی کے علاوہ انگریزی، فارسی، تاریخ ہندو پاک، جغرافیہ اور زراعت کے مضامین بھی شامل ہو گئے۔ انگریزی کے لیے انگلش ٹیچر جناب کے۔ اے دتہ مقرر ہوئے۔ ساتویں جماعت تک نسیم حجازی کے تازہ تاریخی ناول خاک اور خون، آخری معرکہ، آخری چٹان، معظم علی کے علاوہ حسین و یزید اور مقدمہ ابن خلدون کے کچھ حصے میں پڑھ چکا تھا۔ والد صاحب کی دکان پر جا کر روزانہ اخبار بلند آواز سے پڑھ کر انہیں سناتا اور وہ میری اصلاح کرتے تھے حالاں کہ وہ سکول کی ایک جماعت بھی نہیں پڑھے تھے۔ صرف مسجد میں ایک اُردو قاعدہ پڑھ رکھا تھا مگر ان کا مطالعہ کتب بہت وسیع تھا۔ روزانہ اخبار کا مطالعہ تو ان کا معمول تھا۔ آٹھویں جماعت میں آیا تو جغرافیہ دنیا کے ساتھ نقشہ کشی بھی شامل ہوگئی۔ آٹھویں کلاس حضرت قاضی عبدالرشید ارشد اور سید اقبال حسن ایس دی ہیڈ ماسٹر ہمیں پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ ہ مڈل سٹینڈرڈ کی محکمانہ امتحان کی جماعت تھی۔ اس لیے شروع سال ہی سے سکول اوقات کے بعد بلا معاوضہ زائد وقت کی پڑھائی شروع ہوگئی۔ سردیوں میں رات کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاں دو گھنٹوں کے لیے ساری جماعت ان کی نگرانی میں پڑھتی تھی۔ فروری 1954ء میں ایم بی ہائی سکول (موجودہ گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1) حافظ آباد میں امتحان ہوا۔ ہماری رہائش اور طعام کا انتظام ہیڈ ماسٹر صاحب کے توسط سے علی پور روڈ پر واقع ڈیرہ سائیں حسین شاہ کے ایک کمرے میں ہوگیا۔ ڈیڑھ ماہ کے بعد نتیجہ آیا تو ہم سب پاس تھے۔ میں نے 442/800 نمبر سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ چونکہ جلال پور میں کوئی ہائی سکول نہیں تھا اور حافظ آباد میں ہاسٹل میں رہ کر اخراجات کی برداشت کی سکت والد صاحب میں نہ تھی اس لیے نویں جماعت میں ایم بی ہائی سکول کامونکی میں اپنی بڑی ہمشیرہ اور بہنوئی کے ہاں قیام کر لیا۔ سکول میں اساتذہ کی کمی تھی اور دسویں جماعت کے سال کے دوران اساتذہ پورے ہوئے۔ محنت اور زائد وقت غائب۔ صرف بمشکل سے ایک ہفتہ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے رات کو ایک مسجد میں انگریزی پڑھائی۔ اس دوران سکول فٹ بال ٹیم کا کپتان رہا، اُردو اور فارسی کا مانیٹر رہا۔ ضلعی سطح پر منعقدہ گورنمنٹ ہائی سکول جی ٹی روڈ گوجرانوالہ میں تقریری مقابلے میں اپنے سکول کی نمائندگی کی اور پانچویں نمبر پر رہا۔ لاہور بورڈ کی طرف سے امتحان میٹرک منعقدہ 1956ء میں شریک ہوا اور سوائے اُردو، فارسی باقی سب مضامین میں ناکام رہا۔ بس پھر کیا تھا دوبارہ پڑھنے سے سفید انکار کر دیا اور ان ٹرینڈ ٹیچر تعینات ہونے کی رٹ لگا لی۔ جے وی کے داخلے کے لیے مڈل تک تعلیم کی بنیاد پر نارمل سکولوں میں داخلہ کے لیے

درخواستیں طلب کی گئیں۔ میں نے بھی گوجرانوالہ دفتر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میں درخواست جمع کرا دی۔ مجھے کوئی انٹرویو کال نہ آئی، معلوم ہوا کہ میری درخواست ہی گم ہو گئی تھی۔ سال ضائع ہو گیا۔ اس دوران ہماری گلی میں محمد اقبال صاحب نہری پٹواری رہتے تھے میں ان کے ہاں نہری پٹواری کا کام سیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اسے زمیندار ربیع اور خریف کے موقع پر فصلانہ بھیجتے ہیں۔ تنخواہ کم ہے اور فصلانہ پر گزر بسر کرتا ہے۔ میں نے یہ کام چھوڑ دیا کہ یہ حلال روزی نہیں ہے۔ میرے والد صاحب کے ایک دوست نے مجھے پولیس میں بھرتی کے لیے کہا۔ میں نے پولیس میں بھرتی سے بھی انکار کر دیا کہ یہ لوگ رشوت لیتے ہیں۔ ان کی کمائی بھی حرام ہے۔ پھر میرے والد صاحب کے ایک دوست عبدالوہاب آرائیں سکنہ سادھوکی قادیانی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے مزید تعلیم کے تمام اخراجات اور شادی کا ذمہ لینے کا کہا۔ میں نے اسے بھی انکار کر دیا؟ حالاں کہ اس دوران مرزائیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ ہی تصور کرتے تھے۔ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے بعد میرے بہنوئی نے مجھے کامونکی اپنے ہاں مالی پٹواری کا کام سکھانے میں مصروف کر دیا۔ وہ بھی میں نے چھوڑ دیا کیونکہ میں نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ اگلے سال مڈل کی بنیاد پر نارمل سکولوں میں جے وی کلاس میں داخلے کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں۔ ہیڈ ماسٹر نے والد صاحب کے دوست میاں امیر بخش بی اے پی ٹی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر موجودہ ہیڈ ماسٹر جناح میموریل ہائی سکول گوجرانوالہ کے توسط سے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز گوجرانوالہ کے دفتر میں درخواست برائے داخلہ جے وی کلاس جمع کرا دی۔ انٹرویو کے لیے کال لیٹر آیا۔ مقررہ تاریخ پر بہنوئی کے ہمراہ گورنمنٹ نارمل سکول نارووال، انٹرویو کے لیے گیا۔ سلیکشن ہو گئی اور میرا نام گورنمنٹ نارمل سکول قصور کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔ بس پھر کیا تھا، بہت خوشی ہوئی اور قصور جانے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ کسی، کھرپہ، بالٹی، دو جوڑا بستر کی دو سفید چادریں، تکیہ وغیرہ باندھا اور مقررہ تاریخ پر نارمل سکول قصور پہنچا۔ صبح کا وقت سکول میں اور بعد میں ہاسٹل گزارا جاتا۔ بندھا ٹکا ٹائم ٹیبل، وقت پر ناشتہ، دوپہر کے بعد شام کا کھانا، دس بجے تک پڑھائی پھر سو جانا۔ علی الصبح 5 بجے پی ٹی صاحب کی وسل اور سب لڑکے (پیلو پل ٹیچرز) بنیان، سفید فلیٹ بوٹ، سفید جرابوں میں ڈرل (ورزش) کے لیے تیار۔ اس سے پہلے فجر کی با جماعت نماز کی ادائیگی۔ دس یوم کے لیے کپ ماسٹرز ٹریننگ اور فرسٹ ایڈ کورس کے لیے گھوڑا گلی (مری) کیمپ میں جانا پڑا۔ میں وہاں جا کر اسہال کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ دوائیں لیں مگر آرام ندارد، مکمل ٹریننگ کے بعد ٹیسٹ اور پھر سرٹیفکیٹس کی تقسیم، رختِ سفر باندھا اور واپس قصور روانگی۔ نو ماہ بعد تحریری اور عملی اسباق کے امتحان ہوئے اور فراغت سے پہلے ادارہ میں سرکاری ملازمت کے لیے اپنے اپنے ضلع کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے نام درخواستیں بھی وصول کر لیں۔ جو انھوں نے خود ہی متعلقہ اضلاع میں بھیجنا تھیں، نتیجہ آیا تو خدا کے فضل و کرم سے 636 نمبر درجہ دوم میں کامیابی نے قدم چومے۔ ابھی سرکاری ملازمت نہ مل سکی۔ اس خالی عرصہ میں والد صاحب کے دوست ابوسعید چودھری غلام نبی حیرتؔ (مصنف اعجاز نطق) کی کوشش سے نشاط ملز ٹیکسٹائل لائل پور (فیصل آباد)

کے قائم کردہ مڈل سکول، نشاط ماڈل سکول میں سرکاری سکیل پر ٹیچر کی ملازمت مل گئی اور یکم ستمبر1958ء کو سکول حاضر ہوا۔ ملک بہاؤالحق ہیڈ ماسٹر بڑی شفقت سے پیش آئے اور مجھے تیسری جماعت پڑھانے کے لیے دے دی گئی اور بھی نئے ملازمین آئے تھے ان کو بھی کلاسیں مختص کی گئیں اور رہائش کے لیے ایک کمرہ ہمیں دے دیا گیا۔ کھانے کے لیے ہوٹلنگ کر لی جاتی۔ میں نے سکول کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی اور دلجمعی کے ساتھ انجام دینا شروع کر دیا۔ مل مالک کے تین بچوں کو شرح دس روپے فی گھنٹہ اور ایک سپننگ ماسٹر کے بچے کو بھی اسی شرح سے پڑھانا شروع کر دیا۔ یکم دسمبر کو آٹھ دن کی چھٹی لے کر گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ میں مدرس کی ملازمت کے لیے ڈی پی پرائمری سکول کوٹ نکہ میں نائب مدرس کی ملازمت کا حکم نامہ آیا ہوا ہے۔ میرے مڈل سکول جلال پور کے اساتذہ اور والدین نے اس ملازمت کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں لائل پور (فیصل آباد) میں ہی ملازمت پسند کرتا تھا۔ بہرحال والدین اور اساتذہ کے فیصلے پر سرتسلیم خم کر دیا۔ آٹھ دن گھر رہنے کے بعد لائل پور آیا۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بتا دیا کہ میرے والدین ضعیف ہیں اور مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت مل گئی ہے۔ مجھے فارغ کر دیں۔ انہوں نے ملز منیجر سے بات کی، ملز انتظامیہ میری کارکردگی سے بہت خوش تھی چناں چہ انھوں نے رہائش، پانی، بجلی، طبی سہولتیں بلا معاوضہ دینے کی پیشکش کی لیکن میں نے استعفا دیا۔ ملز انتظامیہ نے طوعاً وکرہاً منظور کر لیا اور مجھے آٹھ یوم کی چھٹی کی بھی تنخواہ دے دی۔ مجھے الوداعی دعوت دی گئی اور میں 5 دسمبر1958ء کو بادل نخواستہ بوجھل قدموں سکول چھوڑ کر گھر روانہ ہوا۔ اگلے روز 4 دسمبر1958ء کو ڈی پی پرائمری سکول کوٹ نکہ پہنچا۔ وہاں کے اول مدرس قاضی فضل الٰہی صاحب میرے اور جماعت کے کچھ دوستوں کے استاد رہے تھے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ سکول کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔ میں اکیلا سکول کی پانچ جماعتوں کو پڑھاتا۔ رجسٹرار کا کام کرتا۔ قاضی صاحب تو 11 بجے گھوڑے پر آتے اور 1 بجے گھوڑے پر چارہ لاد کر گاؤں فتح کی جو ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا، چلے جاتے۔ کوٹ نکہ کا ڈاک خانہ ایک نوجوان محمد صدیق کے پاس تھا جو میٹرک پاس تھا۔ میرے مشورے پر اس نے جے وی کی ٹریننگ گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ میں مکمل کرنے کی ٹھانی۔ ڈاک خانہ کا چارج مجھے دے دیا اور خود گکھڑ چلا گیا۔ میں نے یہاں سکول کا تمام ریکارڈ درست کیا۔ بچوں کو زائد وقت بھی دیتا۔ سکول میں باغیچہ بنایا، پھول لگائے اور سبزیں اُگائیں، مرغیاں پالیں، سکول کو بنا سنوار کر رکھا، ماٹوز لکھے، ڈاک خانہ کی طرف توجہ دی۔ بچوں کے ذریعے لوگوں کی چھٹیاں ان کے گھروں میں بروقت پہنچنے لگیں۔ سیونگ بینک کا اجراء کیا، لوگوں کے اکاؤنٹ کھولے۔ بچوں میں سمال سیونگ سکیم متعارف کروائی۔ محکمہ تعلیم اور محکمہ ڈاک خانہ جات کے حکام میری کارکردگی سے بہت خوش تھے کیوں کہ سکول کے سو فیصد نتائج آرہے تھے۔ عوام بھی بہت خوش تھے۔ بالآخر والدین کے حکم سے مڈل سکول جلال پور میں تبادلہ کی درخواست دے دی اور میرا تبادلہ 1964ء میں جلال پور بھٹیاں مڈل سکول ہو گیا۔ میں وہاں بعد فراغت پرائمری سکول کوٹ نکہ، مڈل سکول جلال پور بھٹیاں حاضر ہو گیا۔ مگر

کوٹ نکہ کے عوام وخواص چونکہ میری کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ انھوں نے میرا تبادلہ منسوخ کرانے کے لیے اے ڈی آئی سکولز پنڈی بھٹیاں وفد بھیجا۔ چنانچہ اے ڈی آئی صاحب نے مجھے واپس کوٹ نکہ میں حاضری کی ہدایت کردی۔ اب میں کوٹ نکہ اپنے والد صاحب کو لے کر پہنچا۔ گاؤں والے چند سرکردہ حضرات کو سکول بلالیا اور انہیں والد صاحب کی زیارت کروائی۔ والد صاحب نے انہیں سمجھایا چناں چہ انھوں نے اپنی رضامندی نامہ (محضر نامہ) لکھ کر اپنے دستخط ثبت کیے۔ یوں ہم باپ بیٹا واپس جلال پور آ گئے۔

جلال پور مڈل سکول حاضری

جلال پور بھٹیاں مڈل سکول میں حاضری دی۔ سید اقبال حسین ہیڈ ماسٹر اور پانچویں جماعت کے استاد ماسٹر وزیر علی صاحبان دونوں میرے استاد تھے۔ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر قاضی عبدالرشید ارشد بھی میرے استاد تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے میری رضامندی سے جماعت اول پڑھانے کے لیے دی تھی اور ساتھ ہی ہیڈ ماسٹر صاحب اور ماسٹر وزیر علی صاحب کی جماعتوں کو بھی ان کے احکام سے پڑھا دیا کرتا تھا۔ رات کو فارغ اوقات میں پانچ روپے ماہوار پر لڑکوں کو ٹیوشن بھی پڑھا دیا کرتا تھا۔ والد صاحب بیمار ہو گئے، ان کے دو آپریشن کروائے۔ والدہ محترمہ جھلس گئی تین ماہ تک ان کا بھی علاج معالجہ کروایا۔

شادی

ایک سال بعد والدین شادی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ چناں چہ میاں امیر بخش صاحب بی اے بی ٹی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر کی دختر نیک اختر مسماۃ اختر النساء بیگم جو کہ ورنیکلر مڈل پاس تھی، سے میری شادی بڑی سادگی اور وقار سے انجام پائی۔ اپنے محترم کی ہدایت پر میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ اللہ کریم کے فضل سے امتحان میں 587/900 نمبر اور درجہ اول میں کامیاب ہوا۔ 1965ء ستمبر میں بھارتی جارحیت سترہ روز پاک بھارت جنگ کے دوران ٹیچرز نے فوجی تربیت حاصل کی۔ رات کو جاسوسوں کی تلاش کے لیے نکل جاتے۔ دن کو دفاعی فنڈ اکٹھا کرتے۔ محترم قاضی عبدالرشید ارشد ایم اے اُردو ایس وی نے بی ایڈ کی ٹریننگ کے لیے گورنمنٹ ٹریننگ کالج فیصل آباد میں داخلہ حاصل کرلیا اور محترم ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کی تمام تدریسی اور غیر تدریسی ذمہ داریاں مجھے سونپ دیں۔ بشیر احمد عاصی اے ڈی آئی سکولز معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے مجھے پڑھاتے ہوئے دیکھا تو مجھے ایس وی کا امتحان دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں نے ایس وی کا داخلہ بھیج دیا اور گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ میں ایس وی کا امتحان دیا۔ اللہ کے فضل وکرم سے 555/1100 نمبر حاصل کر کے کامیابی حاصل کی پھر ایف اے کی تیاری شروع کردی۔ دن اور رات 10 بجے تک آٹھویں جماعت کو بلامعاوضہ زائد

وقت دیتا اور بعد میں رات کو خود پڑھتا اور خداوند قدوس کے فضل وعنایت سے 555/1000 نمبر حاصل کر کے کامیابی حاصل کی اور ساتھ ہی سی ٹی کی تیاری شروع کر دی۔ داخلہ بھیجا اور 674/1100 نمبر حاصل کر کے کامیاب ہوا۔

بھروکی چیمہ تبادلہ

بطور ایس وی ترقی دے کر ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز لاہور ڈویژن نے گورنمنٹ مڈل سکول بھروکی چیمہ تحصیل وزیرآباد تقرری کے احکام جاری کر دیئے اور میں 1-1-1971 کو بھروکی چیمہ حاضر ہو گیا مگر چند دن بعد قاضی عبدالرشید ارشد ایم اے بی ایڈ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ مڈل سکول جلال پور بھٹیاں کی درخواست پر شمیم مسلم مفتی نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز گوجرانوالہ سے میرا تبادلہ معہ آسامی جلال پور بھٹیاں کا حکم نامہ جاری کروالیا۔

تبادلہ جلال پور

اب جلال پور بھٹیاں مڈل سکول میں تمام تدریسی اور غیر تدریسی ذمہ داریاں حسب سابق سنبھال لیں۔ ساتھ ہی میں نے بی اے کی تیاری بھی شروع کر دی۔ امتحان دیا مگر انگریزی میں کمپارٹمنٹ آ گئی اور 1973ء کے سیلاب نے مکان تباہ کر دیا اور ایک چانس چھوڑ کر اگلے چانس سے فائدہ اٹھایا، امتحان دیا اور 387/700 نمبر حاصل کر کے کامیابی مل گئی اور بی ایڈ کی تیاری میں لگ گیا جس میں 555/1100 نمبر حاصل کر کے کامیابی سے ہمکنار ہوا اور ایم اے اسلامیات کی تیاری کا آغاز کر دیا۔ پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں امتحان دیا اور 337/700 نمبر اور درجہ سوئم میں کامیابی حاصل کی۔ 1980ء میں ایم ایڈ میں پنجاب یونیورسٹی ادارہ تعلیم وتحقیق میں داخلہ مل گیا۔ ایک سال کی سفری بھاگ دوڑ اور محنت کے بعد 73 فیصد نمبر حاصل کر کے کامیابی حاصل کی۔ شائد میرا تعلیمی عمل ادھورا ہی رہ جاتا اگر میری اہلیہ محترمہ مرحومہ میری ہمت نہ بندھاتی، بچوں کی نگہداشت نہ کرتی۔ میری تعلیم کی تکمیل کا سہرا اسی اللہ کی نیک بندی کے سر ہے۔ اس نے نامساعد مالی حالات میں سینہ سپر ہو کر تکالیف کا مقابلہ کیا۔ اللہ رب العالمین اسے اجرعظیم سے نوازے (آمین)۔ سکول کے اوقات کی میں نے پوری پابندی کی۔ طلباء کو بے لوث شبانہ روز محنت کرا کر انہیں اچھے نتائج سے ہمکنار کیا۔ طلبہ کو پوزیشنز بھی حاصل ہوئیں مگر دل میں ایس ایس ٹی کے گریڈ کی خواہش مچلتی ہی رہی کہ ڈائریکٹوریٹ آف کالجز گوجرانوالہ ڈویژن کی طرف سے ایجوکیشن کے مضمون کے لیے ایڈہاک لیکچرار کی تقرری کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں۔ میں نے درخواست دائر کر دی، انٹرویو دیا۔ چند دن بعد معلوم کیا تو پتہ چلا سو کے لگ بھگ اُمیدوار تھے۔ جن میں مَیں میرٹ میں تیسرے نمبر پر رہا تھا۔ ایجوکیشن کے لیکچرار کے لیے دو آسامیاں تھیں۔ ایک آسامی پر گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں سید جعفر حسین شاہ تعینات ہو چکے تھے۔ دوسری آسامی پر گورنمنٹ انٹر کالج علی پور چٹھہ میں لیاقت علی لون کی تقرری ہوئی تھی چونکہ ان کی سلیکشن اُردو کی آسامی پر بھی ہو چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے

ایجوکیشن سے انکار کر دیا ہے۔ اب انہیں اُردو کی آسامی پر تعینات کر دیا گیا اوران کی خالی ہونے والی آسامی پر میری تعینات ہوگئی۔

گورنمنٹ انٹر کالج علی پور چٹھہ میں ایڈہاک لیکچرار ایجوکیشن کی تقرری

میں سکول جلال پور میں آٹھویں جماعت کوانگریزی پڑھا رہا تھااور پڑھاتے پڑھاتے تھک کر میں نے کہا''یااللہ مجھے اب یہاں سے لے جا، یہ کام اب مجھ سے بھاری ہے۔'' اور میں طلبا کی کاپیاں درستگی کے لیے لے کر دفتر ہیڈ ماسٹر صاحب آ گیا۔ وہاں پہلے سے صوفی محمد اکرم خاں صاحب ہیڈ ماسٹر پبلک ہائی سکول بھی تشریف فرما تھے۔ اتنے میں ڈاکیا میرے نام کا زرد رنگ کا لفافہ جس کے کونے پر ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کالجز گوجرانوالہ کی مہر ثبت تھی، مجھے دینے کے لیے آیا اور راستے میں صوفی صاحب نے وہ لفافہ اُچک لیا اُسے پڑھا اور خوشی سے دوڑے دوڑے قاضی صاحب کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ میاں صاحب کو آج ہی فارغ کر دیں یہ کالج جائن کریں۔ مجھے مبارک باد دی، اگلے روز میں علی پور چٹھہ کالج پہنچا جو پی۔ڈبلیو۔ڈی ریسٹ ہاؤس میں چل رہا تھا۔ وہاں لیاقت علی لون لیکچرر اُردو، مجھے بہت خوشی سے ملے اور انھوں نے موجودہ پرنسپل شیخ محمد ارشد جاوید (اس وقت کے لیکچرار فزکس) سے اور باقی ساتھیوں سے میرا تعارف کرایا۔ وہ مجھے پرنسپل پروفیسر محمد ایوب رضا صاحب کے پاس لے گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں 01-02-1984 سے ان شاءاللہ حاضری دوں گا۔ چنانچہ میں 31-1-1984 کو سکول سے فراغت نامہ حاصل کر کے A.D.I.S توثیقی دستخط اور مہر کے بعد سیدھا ڈسٹرکٹ انسپکٹر سکولز گوجرانوالہ اور سروس بک اور فراغت نام پر ان کے تصدیقی دستخط اور مہر لگوا کر واپس جلال پور پہنچا۔ اگلے روز 01-02-1984 کو گورنمنٹ انٹر کالج علی پور چٹھہ باقاعدہ حاضر ہوگیا۔

بطور لیکچرار حاضری

01-02-1984 کو باقاعدگی سے حاضر ہونے سے ایجوکیشن کی کلاس بن گئی۔ اس سارے عمل میں مرحوم لون صاحب اور محترم شیخ ارشد صاحب کی معاونت اور راہنمائی قابل ستائش رہی۔ ایک سال سکون سے تدریسی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں دیگر پروفیسر صاحبان کے ساتھ باہمی میل جول سے گزر گیا۔ چونکہ ایس ایس ٹی تقرری کے لیے بھی پہلے انٹرویو دے رکھا تھا۔ اس لیے اکتوبر 1984ء میں سکول ڈائریکٹوریٹ کی طرف سے گورنمنٹ پبلک ہائی سکول جلال پور بھٹیاں میں بطور S.S.T تقرری کا حکمنامہ موصول ہوگیا۔ مگر مخلص دوستوں کے پرخلوص مشورے پر S.S.T کے طور پر تقرری پر حاضری ترک کر دی۔

آزمائش اور پریشانی کا آغاز

اپریل 1984ء کی تعطیلات کے دوران میرے ایجوکیشن کے ایک طالب علم رانا عبدالسلام جو قادر آباد کا رہائشی تھا نے مجھے ہیڈ قادر آباد سیر کی دعوت دی۔ میں نے مڈل سکول جلال پور بھٹیاں کے ایک استاد ماسٹر بشیر حسین مرحوم (میرا سابقہ طالب علم) کے سسرالی گاؤں کوٹ بخش میں شب بسری کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ میں اپنے اہل خانہ اور بچوں سمیت جونہی علی پور چٹھہ ریلوے ٹرین سے اُترا تو پروفیسر لیاقت علی لون سے اپنی ایڈہاک Termination کی اطلاع اور میری جگہ مہر محمد خاں سینئر ایڈہاک کی آمد کی اطلاع ملی۔ ساتھ ہی انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں کی بجائے کسی اور کالج میں اپنی ایڈجسمنٹ کے ارادے سے چلے گئے ہیں۔ میری اہلیہ پریشان ہوگئی اور مجھ سے لگی پوچھنے کہ ''میاں صاحب اب کیا بنے گا ہم واپس چلے جاتے ہیں۔'' میں نے انہیں تسلی دی کہ جس پروگرام کے لیے ہم آئے ہیں پہلے اسے مکمل کریں۔ میں نے انہیں بس سٹاپ پر ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور خود صورتحال کا مزید پتہ کرنے کالج آیا۔ پروفیسر شیخ محمد ارشد صاحب موجود تھے، انھوں نے مجھے لیٹر دیا اور تسلی دی کہ ہم نے آنے والے ایڈہاک لیکچرار کو یہاں کی صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے اور وہ کسی نزدیکی کالج میں ایڈجسٹمنٹ کے ارادے سے چلے گئے ہیں، آپ مطمئن رہیں اور مجھے کہا کہ کل چودھری علم دین کے بیٹے شفیق صاحب کی شادی کی دعوت ولیمہ میں سارے سٹاف کو شامل ہونے کی دعوت ہے، لہٰذا آپ کل شرکت کے لیے آئیں۔ کل دعوت سے فراغت کے بعد آپ کی ملازمت کی بحالی کا پروگرام بنائیں گے۔ میں یہ پروگرام لے کر بچوں سمیت ہیڈ قادر آباد پہنچا تو ہیڈ پر رانا عبدالسلام کو انتظار میں کھڑے دیکھا۔ ہم نے سیر کی، اس کے ہاں کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران اس نے بتایا کہ آپ کا ٹرمی نیشن لیٹر کالج میں آیا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہ تو ہماری ملازمت کا حصہ ہے۔ پھر ہم ماسٹر بشیر حسین کے سسرالی گاؤں کوٹ بخش چل پڑے، وہاں شب بسر کی۔ آئندہ پروگرام سے متعلق اہلیہ کو آگاہ کیا۔ اسی گاؤں میں دوسرے سکول کے ساتھی ماسٹر ظفر اللہ بھون کو ہماری وہاں آمد کا پتہ چلا تو انھوں نے ہمیں اپنے ہاں شب بسری کی دعوت دی۔

میں نے گھر والوں کو وہیں چھوڑا اور خود علی پور چٹھہ چودھری علم دین صاحب کے بیٹے کی دعوت ولیمہ میں شرکت کے لیے دوستوں کے پاس کالج آ گیا اور شیخ محمد ارشد جاوید صاحب، پروفیسر لیاقت علی لون اور پروفیسر ممتاز حسین مرزا صاحبان نے لاہور DPI(e) آفس جانے کا پروگرام بنایا اور مجھے وہاں پہنچنے کا کہا۔ مقررہ دن وہ تینوں اصحاب مجھ سے پہلے وہاں موجود تھے۔ چنانچہ مجھے اپنی بیعت میں پروفیسر مقصود احمد صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر بجٹ اینڈ پلاننگ کے پاس لے گئے۔ ان سے میرا تعارف کرایا۔ انھوں نے سپرنٹنڈنٹ ایڈمن کو بلا کر اس سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ٹرمی نیٹڈ سینئر ایڈہاک لیکچرر ہیں جونہی حکومت کی طرف سے پابندی اٹھائی جائے گی انھیں سب سے پہلے ایڈجسٹ کر دیا جائے گا۔ گا ہے

گا ہے پتہ کرتے رہیں پھر ہم واپس چلے آئے اور میں کالج میں معمول کی سرگرمیوں میں جُت گیا۔ چھٹی پہ گھر آیا ہوا تھا کہ 01-05-1984 کو فارغ کر دیا گیا۔ میں نے پھر DPI دفتر لاہور آ کر ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب ایڈمن کو مطلع کیا۔ انہوں نے انتظار کرنے کو کہا اور میں اس قدر پریشان اور تذبذب کا شکار تھا کہ میں سابقہ ایس ایس ٹی آرڈرز کی بحالی کے لیے DPI سکولز کی خدمات میں حاضر ہوا۔ انھیں صورت حال بتائی تو انھوں نے بتایا کہ آپ کے نام اس حکم تقرری کی مدت نفاذ تو کب کی ختم ہو چکی ہے اب جب دوبارہ نئی تقرریوں کے لیے درخواستیں طلب کی جائیں گی تو آپ درخواست دے سکتے ہیں۔ پھر کالج ڈائریکٹوریٹ سے رابطہ کیا تو انھوں نے مجھے 09-05-1984 کو گورنمنٹ انٹر کالج ملکوال ضلع گجرات کے لیے ایڈجسٹمنٹ آرڈر جاری کر دیئے جو میں دستی لے کر اس روز رات گئے ملکوال پہنچا۔ رات ایک سرائے میں 15 روپے کے عوض بسر کی، اگلے روز 10-05-1984 صبح کالج وارد ہوا۔ چودھری محمد خاں پرنسپل صاحب سے ملاقات کی انھیں آرڈر دیے۔ لیکن ابھی پانچ دن ہی گزرے تھے کہ پرنسپل صاحب نے مجھے فرمایا کہ ''اس کالج میں لیکچرر پورے ہیں آپ کو تنخواہ نہیں ملے گی میں نے ڈائریکٹر کالجز سے ایڈوائس لے لی ہے لہٰذا آپ DPI صاحب کے پاس جائیں کہیں اور اپنی ایڈجسٹمنٹ کروائیں۔'' چنانچہ میں پھر واپس لاہور یاترا کے لیے دفتر DPI آفس ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب ایڈمن کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری صورتحال سے انہیں آگاہ کیا۔ ڈائریکٹر صاحب نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ ہم نے آپ کو ایڈجسٹ تو کرنا ہی ہے 24-05-1984 کو انھوں نے مجھے مفصل لیٹر بنام ڈائریکٹر کالجز گوجرانوالہ برائے ایڈجسٹمنٹ انٹر کالج ملکوال دیا کہ اس کالج میں دو آسامیاں اسسٹنٹ پروفیسرز کی ہیں۔ ایک آسامی خالی اور ایجوکیشن کا مضمون بھی یہاں منظور شدہ ہے، لہٰذا انھیں (میاں عبدالرحمٰن قاصر) اس کالج میں ایڈجسٹ کریں لیکن گوجرانوالہ ڈائریکٹوریٹ کے سپرنٹنڈنٹ نے ڈائریکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق مجھے وہ خط واپس دے کر کہا کہ اس دفتر کی یہ پریکٹس نہیں ہے، DPI آفس خود ہی ایڈجسٹ کرے۔ میں پھر اُلٹے پاؤں لاہور DPI آفس آیا اور ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کو آگاہ کیا۔ ادھر موسم گرما کی تعطیلات بھی سر پر تھیں۔ اور میں یکم مئی 1984ء سے کسی کالج میں نہ تھا۔ گھر والوں کو میری خبر نہ تھی اور مجھے ان کی نہ تھی کیوں کہ اس دوران میں کبھی کامونکی بڑی ہمشیرہ کے ہاں اور کبھی علی پور چٹھہ کالج میں دوستوں کے پاس شیخ محمد ارشد اور لیاقت علی لون کا مہمان ہوتا۔ وہ مجھے تسلیاں دیتے۔ میں 28 مئی 1984ء کو لاہور DPI آفس حاضر ہوا اور جناب ڈپٹی ڈائریکٹر ایڈمن سے ملاقات کی اور انھیں عرض کیا کہ تعطیلات ہونے کو ہیں اور میں تو کسی بھی کالج میں نہیں۔ انھوں نے سپرنٹنڈنٹ سے ملکوال کالج کی فائل منگوا کر مطالعہ کیا اور مجھے فرمایا کہ اس کالج کے کسی ریگولر لیکچرر کا نام بتائیں۔ میں نے انہیں سید جواد حسین نقوی لیکچرار اُردو کا نام بتایا۔ انہوں نے حکم نمبر 2955-55 مؤرخہ 28-05-84 جاری کر دیا کہ سید جواد حسین نقوی لیکچرار اُردو کو 01-05-1984 سے اسسٹنٹ پروفیسر کی خالی سیٹ پر برائے نکاس تنخواہ ایڈجسٹ کیا جاتا ہے اور اس خالی سیٹ پر میاں عبدالرحمٰن قاصر ایڈہاک لیکچرر کو 01-05-1984 سے ہی

ایڈجسٹ کیا جائے۔ میں خدا کا شکر بجالایا اور آرڈر لے کر رات کو علی پور چٹھہ پروفیسر شیخ محمد ارشد کا مہمان ٹھہرا۔ سب دوست بہت مسرور ہوئے۔ اگلے روز علی الصبح ملکوال پہنچا، محترم پرنسپل صاحب کو آرڈر کی کاپی دی وہ سب دوست اس طرح کی ایڈجسٹمنٹ کا حکم نامہ دیکھ کر حیران ہوئے 01-05-1984 سے حاضری رپورٹ دفتر کے سپرد کی اور سکھ کا سانس لیا۔
03-04-1984 کو فراغت کے بعد 27-05-1984 تک عملی طور پر میں کسی بھی کالج نہ تھا۔ اسی دوران علی پور چٹھہ کالج میں گوجرانوالہ بورڈ کی طرف سے ایجوکیشن کے پرچہ جات کے مارکنگ کے لیے دو بنڈل آئے تھے وہ محترم پرنسپل صاحب نے واپس بورڈ کو ارسال کر دیئے۔ تعطیلات کے لیے گھر آیا تعطیلات ختم ہونے پر واپس ملکوال آیا۔ پروفیسر محمد عباس نجمی (پنجابی پروفیسر اوصاف الحق (اکنامکس)، پروفیسر رشید احمد (ہیلتھ اینڈ فزیکل ایجوکیشن) اور بندہ ہم چاروں نے ایک چوبارہ 25 روپے ماہوار پر کرایہ پر لیا اور اپنی مدد آپ کے تحت رہنے لگے۔ پرنسپل صاحب نے مجھے کہا کہ میاں صاحب! آپ سکول سائیڈ میں کافی عرصہ تک پڑھانے کا تجربہ رکھتے ہیں اور میرے کالج میں کوئی انگلش کا لیکچرر نہیں ہے لہٰذا آپ یہ خدمت انجام دیں۔ میں نے حامی بھر لی، اگلے روز رجسٹر مکمل کر کے کلاس میں حاضر ہوا۔ 90 لڑکوں کی کلاس تھی۔ حاضری پکارنے کے بعد طلبا کو تعارف کرایا، انہیں بتایا کہ جب تک انگریزی کے کوئی صاحب نہیں آتے میں یہ خدمت انجام دوں گا بتائیں ہم آج کہاں سے شروع کریں۔ اس سوال کے جواب میں سب طلبا نے اپنے منہ بند کر کے ''اُوں اُوں'' کی آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ میں ان کی اس حرکت سے کوئی پریشان نہ ہوا بلکہ ہنس دیا۔ میں نے انہیں رکنے کو کہا طلباء خاموش ہو گئے۔ میں نے انھیں کہا کہ آپ کا سابقہ آموختہ ناپختہ ہے کل دیکھیں گے کلاس ختم ہوئی اور میں سٹاف میں آ گیا۔ کسی سٹاف ممبر سے کوئی بات نہ کی۔ اگلے دن کلاس کی حاضری لگائی اور ان سے وہی کل والا استفسار کیا۔ طلباء نے وہی کل والی حرکت کا اعادہ شروع کر دیا۔ میں خاموشی سے دیکھتا رہا اور مسکرا دیا اور کہا کہ کل انشاءاللہ دیکھیں گے۔ میں کلاس سے باہر نکلا اور طلباء بھی۔ راستے میں ایک لڑکے کو میں نے کالر سے پکڑا اور اسے سٹاف روم میں کھینچ کر لے آیا۔ اسے ڈانٹ ڈپٹ کی تو وہ رونے لگا۔ اس سے نام، والد کا نام اور کام پوچھا۔ سٹاف روم میں موجود لیکچرار اس صورتحال سے پریشان ہو گئے اور مجھے کہا کہ اسے آپ پرنسپل صاحب کے پاس لے جائیں۔ میں نے اسے کہا ''تمہارے والدین تم پر اپنے خون پسینہ کی کمائی خرچ کر رہے ہیں اور تم نے اسے ضائع کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ اگر آئندہ تم نے اس قسم کی حرکت کی تو سخت ایکشن لوں گا۔'' اس نے مجھ سے تحریری معافی مانگی اور سٹاف روم میں موجود تین لیکچرار صاحبان نے Recommend کیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اب اس کارروائی کا علم کلاس کے باقی طلباء کو بھی ہو گیا۔ اگلے روز کلاس میں گیا تو ھُو کا عالم تھا۔ حاضری کے بعد گزشتہ دو روز کی کارروائی نہ دہرائی گئی۔ سب طلباء خاموش رہے اب میں نے اُن سے اُردو کا ایک فقرہ ''وہ ایک درخت ہے'' کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کو کہا پوری کلاس میں صرف ایک لڑکے نے بتایا وہ بھی غلط کہ ''He is a tree''میں حیران ہوا۔ انہیں درست

ترجمہ بتایا اور سابقہ کمی دور کرنے کے لیے سخت محنت کرنے کی تلقین کی۔ میں نے ان کو انگریزی لکھائی کے لیے a,b,c اور جڑویں حرف سکھائے اور سادہ اُردو جملوں کو انگریزی میں ترجمہ کرنا سکھانا شروع کر دیا۔ان کا تحریری کام چیک کرتا رہا، زبانی بھی مشق کرواتا۔ چھٹی جماعت کے بچوں کی طرح تختہ سیاہ پر انگریزی کی کتاب بک ون سے مشکل الفاظ اور ان کے معانی واقفیت کروائی خط تحریر بہتر کرنے کی کوشش کی۔ یہ اپنے مضمون ایجوکیشن کے علاوہ اضافہ ذمہ داری تھی جو میں نے نبھائی کہ انگریزی کے لیکچرر کی تعیناتی عمل میں آ گئی۔ پرنسپل صاحب بہت خوش ہوئے۔ وقت اچھا گزر رہا تھا جنوری کے اوائل سے کالج میں دسمبر ٹیسٹ کا انعقاد ہو رہا تھا اور بندہ بطور اپنی کنٹرولر امتحانات فرائض انجام دے رہا تھا۔

منتخب لیکچرر کی آمد اور روانگی

14-01-1985 کو مسٹر عبدالرشید قمر پنجاب پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہو کر بندہ کی جگہ تقرر نامہ لے کر پہنچ گئے۔ محترم پرنسپل صاحب کے پاس دفتر میں مَیں پہلے ہی موجود تھا۔ انہوں نے عبدالرشید قمر کو مشورہ دیا کہ آپ کسی اپنے نزدیکی کالج میں تعیناتی کے لیے کوشش کریں اور مجھے بھی DPI آفس رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ مَیں بھی سوئے لاہور کوچ کر گیا۔ DPI صاحب نے قمر صاحب کو گورنمنٹ کالج فیصل آباد پوسٹ کر دیا اور میرے ٹرمینیشن آرڈرز واپس لینے کا لیٹر مجھے تھما دیا۔ میں واپس ملکوال کالج آ گیا۔ پرنسپل صاحب بہت خوش ہوئے۔ میں پھر اسی سابقہ جذبے کے ساتھ تعلیمی سرگرمیوں میں مگن ہو گیا۔ موسم گرما کی تعطیلات گزارنے کے لیے اس ارادے سے گھر پہنچا کہ تعطیلات کے بعد ملکوال میں مستقل رہائش اختیار کر لوں گا اور بچوں کو پاس رکھوں گا۔ تعطیلات کے دوران ڈگری کالج حافظ آباد تبادلے کے لیے جلال پور بھٹیاں سے اپنے ایک دوست حاجی فضل الٰہی کمیشن ایجنٹ اور رائس ڈیلر کو ساتھ لے کر چودھری ارشاد اللہ تارڑ ممبر مجلس شوریٰ اور حاجی امداد اللہ تارڑ، رسول پور تارڑ سے سیکرٹری تعلیم مہر جیون خاں سے سفارش کرنے کی گزارش کی۔ لیکن بڑوں کی بڑی ہی باتیں ہوتی ہیں، ان کے عدم مثبت رویہ سے مایوسی ہوئی، اسی دوران 29 اگست 1985ء کو پروفیسر شیخ محمد ارشد جاوید صاحب کا فون پر پیغام آیا کہ کل 30 اگست علی پور چٹھہ آ ئیں۔ آپ کا تبادلہ علی پور چٹھہ ہو گیا ہے۔ اپنے آرڈر وصول کریں۔ میں خداوند کریم کے حضور سجدہ شکر بجا لایا۔ ضرب المثل سچ ثابت ہوئی ''کہ دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے''۔ میں خوشی خوشی علی پور چٹھہ شیخ صاحب کے ہاں پہنچا۔ شیخ صاحب نے مجھے خوش خبری سنائی اور رات پروفیسر وقار حسین طاہر، انچارج پرنسپل کے ساتھ دکان میں ٹھہرا۔ صبح نماز فجر کے بعد پرنسپل صاحب نے تبادلہ کے احکام دیئے۔ معلوم ہوا کہ پیپلز کالونی گوجرانوالہ میں نئے انٹر کالج کے اجراء پر جناب محمد منشاء گورائیہ علی پور چٹھہ سے تبدیل ہوئے اور ان کی خالی ہونے والی جگہ پر میرے دوستوں شیخ محمد ارشد جاوید اور لیاقت علی لون کی کوششوں سے میرا تبادلہ ملکوال سے علی پور ممکن ہوا۔ لون صاحب تو PPSC کی طرف سے منتخب ہو کر بطور

پرنسپل گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول گھوڑے شاہ لاہور تعینات ہو چکے تھے۔ میں حکم نامہ کی کاپی لے کر 30-08-1985 کو پرنسپل ملکوال کے پاس ان کی رہائش ریڑھکا بالا حاضر ہوا۔ ان سے فراغت ناموں پر بصد اصرار دستخط کروائے اور اگلے روز 31-08-1985 کالج سے مہریں اور ڈاک نمبر لگوا کر رخت سفر باندھ کر شام کو براستہ سرگودھا چنیوٹ پنڈی بھٹیاں، جلال پور پہنچا، گھر والوں کو خوشی ہوئی۔

واپس علی پور چٹھہ تعیناتی

01-09-1985 کو علی پور چٹھہ حاضر ہوا۔ ستمبر ٹیسٹ شروع تھے۔ پرنسپل صاحب ڈیوڑھی میں براجمان تھے۔ میں نے انھیں حاضر ہونے کے لیے درخواست پیش کی۔ جائننگ رپورٹس پر ان کے دستخط ثبت کروائے اور ان کا شکریہ ادا کیا لیکن اس دوران ان کے چہرے کے نقوش سے حاکمانہ اثرات عیاں تھے۔ جس کی نشاندہی میں نے شیخ ارشد صاحب سے کر دی۔ انھوں نے مجھے تسلی دی۔ میں نے انھیں بتایا کہ مجھے قرائن اچھے نظر نہیں آتے۔ مجھے پرنسپل صاحب موصوف نے ملازمین درجہ چہارم کا انچارج اور تمام سٹاف کی طرف سے رخصت ہائے اتفاقیہ کی وصولی اور اپنی سفارشات کے ساتھ پرنسپل صاحب کے پاس ان کی ترسیل اور کنٹرولر امتحانات کی ذمہ دریاں سونپ دیں۔ جنھیں مَیں نے بسر و چشم قبول کر کے نبھانا شروع کر دیا۔ علی پور اور مضافات کے عوام اپنے اچھی لیاقت کے حامل طلباء کو گوجرانوالہ اور لاہور کے کالجوں میں داخل کروا دیتے ہیں اور تھرڈ ڈویژن اور بمشکل درجہ دوم حاصل کرنے والے لڑکوں کو اس کالج میں داخل کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نتائج بھی ایسے لڑکوں سے خوش نما نہیں مل سکتے۔ بورڈ کے نتائج آئے ہوئے تھے اور کالج کے نتائج حوصلہ افزا نہ تھے جسے پرنسپل صاحب لے کر سر کردہ اصحاب کے ڈیروں پر لے جا رہے تھے۔ درجہ چہارم کے ایک غریب بیلدار کو ڈانٹ ڈپٹ کر نوکری سے فارغ کر دیا۔ پروفیسر صاحبان کے ساتھ بھی ان کا رویہ آمرانہ اور حاکمانہ ہونے لگا۔ لڑکوں کو دفتر بلا کر ان سے پیار بھری گفتگو کر کے اساتذہ کے خلاف ان کے اذہان مسموم کرنا شروع کر دیا۔ سٹاف میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنا معمول تھا۔ اب جناب ڈائریکٹر کالجز کے پاس جا کر سٹاف کے تبادلوں کے متعلق انہیں کہنا شروع کر دیا۔ سٹاف کے درمیان بھی اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے حالا کہ پرنسپل صاحب کو پروفیسر محمد ارشد جاوید اور لیاقت علی لون ہی نے یہاں تبادلہ کا مشورہ دیا تھا اور پھر یہاں ان کی رہائش اور دیگر سہولیات فراہم کی تھیں۔

دور خلفشار

سالانہ امتحانات کا انعقاد تھا، ان بدگمانیوں اور اختلافات کے نتیجہ میں امتحانی ڈیوٹی کے درمیان پروفیسر گلزار احمد اور پروفیسر شیخ محمد ارشد جاوید کے درمیان جھگڑا ہو گیا جسے پرنسپل صاحب نے خوب ہوا دی۔ طلباء کو پہلے ہی ورغلایا جا چکا تھا۔ طلباء نے امتحانی کاپیاں پھاڑ دیں اور کمروں سے باہر پرنسپل صاحب کے حق میں نعرے بازی کرتے نکل آئے جس کا بظاہر کوئی

جواز نہ تھا۔ تھانہ جا کر FIR تک درج کروادی اور جناب امتیاز احمد چیمہ صاحب ڈائریکٹر کالجز کے پاس گلزار احمد صاحب کو لے کر چلے گئے۔ بعد میں شیخ محمد ارشد جاوید اور میں ہم دونوں بھی جناب ڈائریکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ انہیں سارے واقعات گوش گزار کیے۔ انھوں نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب کو انکوائری کے لیے بھیجا۔ سٹاف اور ملازمین نے بیانات قلم بند کرائے لیکن وقار صاحب نے انکوائری آفیسر کے ساتھ کوئی تعاون نہ کیا۔ میں روزانہ ڈیٹ شیٹ لگا تا اور سیٹنگ پلان کے مطابق طلبہ کی سیٹیں لگوا تا۔ طلبہ کو اس قدر بھڑ کایا جا چکا تھا اور انھیں بلا امتحان اگلی جماعت میں پڑھانے کا کہہ رکھا تھا کہ وہ ہر روز کالج آ کر سیٹنگ پلان پھاڑ جاتے اور کرسیاں اکھاڑ پچھاڑ جاتے۔ میں نے اس واقعہ سے متعلق ڈیوٹی افسران سے رپورٹس تحریر کروالی تھیں اور پھاڑے ہوئے پرچے بھی سنبھال رکھے تھے۔ اس دوران شیخ محمد ارشد جاوید صاحب کی PPSC کی طرف سے سلیکشن ہو چکی تھی، انھیں اس کالج میں ایڈ جسٹ نہ ہونے دیا گیا تو شیخ صاحب اسلامیہ کالج گوجرانوالہ ایڈ جسٹ ہو گئے۔ اب پرنسپل، اُردو کے لیکچرار محمد اکرم قمر صاحب میرے درپے ہو گئے کہ انہیں یہاں سے تبدیل کر دیا جائے۔ ڈائریکٹر صاحب کو معلوم تھا کہ وقار صاحب طلباء کو گاڑیوں میں بھر کر دفتر لاتے ہیں اور لاہور سیکرٹریٹ بھی لے کر جاتے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب نے انہیں اپنا رویہ درست کرنے کو کہا مگر وقار صاحب کالج کے پرامن ماحول کو داؤ پر لگا چکے تھے۔ بغیر امتحان ڈیٹ شیٹ کے اختتام پر میں تین دن کی رخصت پر گھر آ گیا۔

خلفشار کا خاتمہ اور سید ذوالفقار علی شاہ بطور پرنسپل

چوتھے روز جب میں کالج پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ جناب وقار حسین طاہر سینئر لیکچرار اسلامیات انچارج پرنسپل کا تبادلہ یہاں سے گورنمنٹ سرسید کالج گجرات اور گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ سے سید ذوالفقار علی شاہ اسسٹنٹ پروفیسر کا تبادلہ بطور پرنسپل گورنمنٹ انٹر کالج علی پور چٹھہ عمل میں آ چکا ہے اور وقار صاحب کو ان کی غیر حاضری میں ہی یہاں سے فارغ کر کے رپورٹ جناب ڈائریکٹر کالجز کو ارسال کی جا چکی ہے۔ محترم شاہ صاحب نے طلباء کو بڑے شفقت آمیز انداز میں پرامن رہ کر کالج کی معمول کی سرگرمیوں میں شریک ہونے کی نصیحت کی۔ یوں کالج میں سکون کی فضا در آئی۔ طلباء کو ایک روز بعد اساتذہ کی معیت میں منگلا ڈیم کی معلوماتی سیر کرائی گئی اور ایک دن بعد امتحانی عمل شروع کر دیا گیا جو انتہائی پرامن ماحول میں اختتام پذیر ہوا۔ اساتذہ کرام نے تمام شکر رنجیوں کو بھلا کر پرامن اور پرسکون ماحول میں تعلیمی سرگرمیوں میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں مگن تھے کہ انٹر کالج پیپلز کالونی گوجرانوالہ میں پرنسپل کی آسامی خالی ہو گئی تو محترم شاہ صاحب نے یہاں سے اپنے گھر گوجرانوالہ تبادلہ کروالیا۔ انہیں بھرپور اور پرخلوص انداز میں الوداعی دعوت دی گئی اور موصوف شاہ صاحب اپنے دور کی اچھی یادیں چھوڑ کر یہاں سے فارغ ہوئے، بعد میں بھی وہ اپنی ملاقاتوں میں یہاں کے گزرے ہوئے زمانے کو بڑے اچھے

پیرائے میں بیان کیا کرتے تھے۔

بطور پرنسپل جناب محمد اسحاق صاحب

محترم شاہ صاحب کے بعد پروفیسر محمد اسحاق صاحب اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ سے بطور پرنسپل یہاں تعینات ہوئے۔ان کا دور بھی بغیر بدشگونیوں، بدظنیوں اور بغیر کسی قسم کے باہمی اختلافات کے بہت پرسکون اور اطمینان بخش اور کالج کی تعلیمی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے لحاظ سے بہت پرامن اور مفید تھا۔محترم محمد اسحاق صاحب واپس گوجرانوالہ تبادلہ کروا کر تشریف لے گئے۔ جناب پروفیسر محمد اسحاق صاحب کے بعداب کالج بغیر پرنسپل رہ گیا اور عارضی چارج جناب محمد افضل لیکچرار ریاضی کے پاس آ گیا۔

بطور ریگولر لیکچرر پوسٹنگ

27-07-1986 کو PPSC کے انٹرویو کے نتیجہ میں میری اور گلزار احمد صاحب کی بطور ریگولر لیکچررز اسی کالج میں پوسٹنگ ایڈجسٹ منٹ ہوگئی اور یوں ہمارے سروں سے ایڈہاک ازم کی تلوار کا سایہ ٹل گیا۔خداوند قدوس کے حضور سجدہ شکر ادا کیا اوراس دورِخلا میں مَیں اپنے ہمکار احباب کے ہمراہ طلبہ اور کالج کے مفاد میں ذہنی سکون سے اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں مگن رہا۔

پروفیسر ممتاز حسین مرزا بطور پرنسپل

پروفیسر ممتاز حسین مرزا گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر متعین تھے اور علی پور چٹھہ میں سکونت پذیر تھے وہ ہم سب دوستوں کی درخواست پر یہاں بطور پرنسپل تشریف لائے ان کا عرصہ ملازمت کالج کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے بہت مثالی رہا۔ گوسٹاف کی کمی کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔اس کمی کو بانٹنے کے لیے خود پرنسپل کے ساتھ بندہ نے ہاتھ بٹانے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔طلبہ کو اُردو، انگریزی، مطالعہ پاکستان تک پڑھایا اور بورڈ سے بالا نتائج آئے۔پچھلے ادوار کی نسبت محترم مرزا صاحب کے زمانے میں تمام پروفیسر صاحبان نے تقریبات کے انعقاد میں بھرپور تعاون کیا۔ بندہ نے بطور سٹیج سیکرٹری کے طور پر اور سالانہ رپورٹ کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا۔

الاخوان کا اجرا

یہ ممتاز حسین مرزا صاحب کی قائدانہ اور مدبرانہ صلاحیت کے طفیل ممکن ہوسکا کہ کالج مجلّہ ''الاخوان'' کے نام کی محکمہ اطلاعات کی جانب سے ڈیکلریشن کی منظور حاصل کی گئی اور پھر محترم ڈاکٹر محمد اقبال لیکچرر سوکس کی اعانت سے بندہ کی کاوش سے میگزین منصۂ شہود پر آیا۔اس مجلّہ کی افتتاحیہ نظم اور طلبہ کے منظوم کلام کی اصلاح میں میرے استاد گرامی اور سکول ملازمت

کے زمانے کے ہیڈ ماسٹر صاحب قاضی عبدالرشید ارشد ایم اے بی ایڈ کی محنت اور کاوش قابل صد ستائش ہے۔

موصوف مرزا صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک ماہ تک جناب ڈائریکٹر کالجز کے حکم سے انچارج پرنسپل کا اعزاز مجھے حاصل رہا۔ جسے میں نے حسب سابق اپنے محترم رفقاء کے باہمی تعاون اور مشاورت سے انجام دیا تانکہ پروفیسر عبدالقیوم رتو اسسٹنٹ پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج سانگلہ ہل سے تبدیل ہو کر یہاں بطور پرنسپل تشریف لائے۔

پروفیسر عبدالقیوم رتو بطور پرنسپل

پروفیسر عبدالقیوم رتو صاحب پرنسپل یہاں کیا آئے انہیں اپنے کاروبار سے ہی فرصت نہ تھی کہیں کہیں وہ حافظ آباد میں سکول چلا رہے ہیں، کہیں چاولوں اور پھک کا کاروبار ہے۔ کہیں نمک پیس کر آیوڈین ملا کر پیکٹوں میں پیک کر بیچنے کا کاروبار، کھادوں کی فروخت کا کاروبار ہو رہا ہے۔ الغرض ان تمام تاجرانہ مصروفیات سے بمشکل ایک ہفتہ میں ایک دن وہ وقت نکال کر کالج تشریف لاتے تھے۔ باقی بندہ جانے اور بندہ کے دوست پروفیسر صاحبان۔ میں نے ساتھیوں سے گزارش کر رکھی تھی آپ سب اس کالج کے خود ہی امین ہیں۔ کالج کی تمام تعلیمی سرگرمیوں اور تقریبات میں ان مخلص دوستوں کا تعاون واشتراک مثالی رہا ہے۔ ایک بار کالج میں NCC کی فل ڈے تربیت ہو رہی تھی۔ جس کا دورانیہ بیس دن پر محیط تھا۔ چھ پروفیسر صاحبان جو دور دراز کے تھے گھروں کو چلے گئے کیونکہ تدریسی کام تو منقطع تھا اس لیے وہ فارغ تھے مگر آخری سے ایک دن قبل جناب چودھری امان اللہ چیمہ ڈائریکٹر کالجز گوجرانوالہ صبح ہی کالج تشریف لے آئے۔ میری ٹرین لیٹ تھی مجھے باہر ملازمین نے بتا دیا تھا کہ چیمہ صاحب تشریف لائے ہیں مگر میں کھینچے کھینچے میں دفتر پہنچا۔ بڑے پرتپاک سے ملے۔ چائے منگوائی۔ انہوں نے گزٹڈ اور نان گزٹڈ سٹاف کے رجسٹرات حاضری چیک کیے تو چھ پروفیسر صاحب غیر حاضر تھے۔ انہوں نے ان کی بابت مجھ سے استفسار کیا۔ میں نے انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کر کے بتایا کہ طلباء تو NCC کی تربیت میں مصروف رہتے ہیں، اس لیے میں نے ان صاحبان کو جانے کی رخصت دے دی ہے اور پرنسپل صاحب کو آپ بہتر جانتے ہیں جس چٹ پر ان کے نام لکھے ہوئے تھے وہ محترم چیمہ صاحب سے مَیں نے لے لی اور دفتری عملہ کو ہدیات کی کہ ابھی ان سب حضرات کو فون کر کے پرسوں کی حاضری کا پابند کر دیں۔ یوں چیمہ صاحب تو خوشگوار ماحول میں تشریف لے گئے۔ ساتھی حضرات کو واپسی پر اس صورتحال کا پتہ چلا تو وہ بہت مطمئن اور مسرور ہوئے۔

پنڈی بھٹیاں تبادلہ اور واپسی

جلال پور بھٹیاں سے 13 میل کے فاصلے پر پنڈی بھٹیاں میں گورنمنٹ ڈگری کالج قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کالج کے پروجیکٹ ڈائریکٹر گورنمنٹ ڈگری کالج حافظ آباد کے پرنسپل صاحب کے تعاون اور اعانت سے وہاں تبادلے کی کوشش جناب رتو صاحب کی سفارس سے کی اور تبادلہ کا حکم نامہ مجھے مل گیا اور میں خاموشی سے تعطیلات موسم گرما کے آخری

دن کالج سے فارغ ہوکر اگلے دن یکم ستمبر کو وہاں پنڈی بھٹیاں حاضری دے دی۔ جب حافظ آباد اپنی عارضی قیام گاہ پہنچا تو علی پور چٹھہ کالج کے تمام احباب کو گھر موجود پایا۔ انہوں نے پرنسپل صاحب حافظ آباد کے توسط سے کل سے واپس علی پور چٹھہ کے لیے اصرار کیا چنانچہ اگلے روز میں پھر کالج پہنچا تو کالج کے طلبا اسلحہ سمیت دو گروپوں میں آمنے سامنے کھڑے تھے اور پروفیسر صاحبان ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے لڑکوں کو سمجھا کر کلاسوں میں بھیجا۔ سرغنوں کو دفتر بلا کر ان کی صلح کروائی کہ ''الصلح خیر''اور یوں تعلیمی عمل رواں دواں ہو گیا اور پروفیسر صاحبان کی جان میں جان آئی۔

رتو صاحب کی تجارتی مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں کہ انہوں نے کالج دفتر کو ہی ان تجارتی سرگرمیوں کا اڈا بنا لیا۔ لوگوں کا آنا جانا تعلیمی سرگرمیوں میں خلل کا باعث تھا۔ کالج سٹاف اس صورتحال سے بہت پریشان ہونے لگا بالآخر کاروبار میں گھاٹا پڑا یا کیا ہوا؟ کہ رقوم مانگنے والوں کا تانتا بندھنے لگا اور لوگوں نے دفتر پرنسپل میں ہی ڈیرے لگا لیے اور رتو صاحب نے کالج سے غیر حاضری کا باقاعدہ معمول بنا لیا۔ حتیٰ کہ رقوم مانگنے والوں نے تھانوں میں مقدمات کے لیے درخواستیں داغنا شروع کر دیں۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ رتو صاحب موصوف کو تھانہ علی پور چٹھہ کی حوالات میں بھی بند ہونا پڑا۔ اس کے طلبا، اساتذہ اور محکمہ تعلیم اور عوام میں کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ کالج بغیر پرنسپل رواں دواں تھا جس کی ذمہ داری میں نے از خود سنبھال رکھی تھی۔

جناب محمد بشیر سیال صاحب بطور پرنسپل

بس پھر کیا تھا ''آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹکے'' کے مصداق اسلامیہ کالج گوجرانوالہ جناب محمد بشیر سیال A.P اسلامیات بطور پرنسپل آوردہوئے۔ ان کی اپنی ہی رگ تھی اپنے ہی مقاصد تھے۔ انھوں نے کوٹھی میں گھر کے افراد کے علاوہ ایک موٹا تازہ شخص بھی رکھا ہوا تھا جسے وہ اپنا مرشد کہتے تھے۔ اس نے ایک بندر یا پال رکھی تھی۔ سیال صاحب کا فرمان تھا کہ یہ حضرت میری غیر حاضری میں گھر کی رکھوالی بھی کرتا ہے۔ سٹاف اور ملازمین میں موصوف پرنسپل صاحب کے متعلق مختلف قسم کی چہ مگوئیاں جنم لے رہی تھیں۔ موصوف نے کالج بلڈنگ کے سامنے دائیں طرف مسجد کی تعمیر کا پروگرام بنایا اور مسجد کی تعمیر کے لیے عرصہ سے جمع کیا جانے والا مسجد فنڈ درجہ سوم کی اینٹوں میں اڑا دیا۔ یوں یہ ساری رقم غتر بود کر دی۔ اب کوٹھی کیا تھی پیر صاحب کا دربار تھی یہاں پھونکیں مروانے والی خواتین اور حضرات کا تانتا بندھا رہتا جسے سٹاف نے بُرا محسوس کیا۔ مگر سمجھانے کی کوشش کی گئی تو وہی ڈھاک کے تین پات سیال صاحب اپنی بات کے پکے رہے۔

میری بطور اسسٹنٹ پروفیسر ایجوکیشن ترقی

13-11-1998 کو میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ایجوکیشن نوٹیفکیشن کی رُو سے 18-11-1998 کو علی پور چٹھہ سے

فارغ ہوکر1998-11-20 کو گورنمنٹ ڈگری کالج شکر گڑھ حاضر ہوا۔علی پور کے دوست حیران تھے کہ میاں صاحب کا علی پور چٹھہ کالج میں ایڈجسٹ منٹ کا کیس تیار کر کے سیال صاحب کو دیا گیا تھا جس کی ایک نقل میاں صاحب نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ سیال صاحب نے کہا تھا کہ وہ خود ان کا یہاں ایڈجسٹمنٹ کا کیس جناب ڈائریکٹر کالجز گوجرانوالہ کی وساطت سے جناب DPI صاحب کے پاس لاہور خود لے جائیں گے اور ان کے یہاں کے ایڈجسٹمنٹ آرڈر لے آئیں گے مگر یہ سارا معاملہ تو پرنسپل صاحب کے خلاف ہو گیا ہے۔مَیں نے شکر گڑھ کالج سے حاضری رپورٹ مکمل کرا کر واپس راستے میں نارووال ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس اپنی تنخواہ کا کیس مکمل کروایا۔شکر گڑھ کالج میں چودھری عبدالشکور لیکچرر تاریخ علی پور چٹھہ سے تبدیل ہو کر یہاں آئے تھے اور سابق پرنسپل صاحب جناب سید دلاور حسین شاہ (مرحوم) گوجرانوالہ بورڈ میں صدر ممتحن اسلامیات ہوا کرتے تھے اور میں ان کے تحت سائنس کے انٹر کے طلباء کے اسلامیات لازمی کی جوابی کاپیاں مارک کیا کرتا تھا۔ان کے صاحبزادے محمد لطیف شاہ صاحب لیکچرر اسلامیات سے اس حوالے سے شناسائی ہو گئی۔ کالج میں انٹر سطح تک ایجوکیشن کا مضمون متعارف تھا اور چار سو طلبہ کو لیکچررز پڑھا رہے تھے۔ میں وہاں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھا۔انہیں ایام میں مَیں علی پور چٹھہ آیا تو پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال اور دوسرے احباب نے مجھے علی پور چٹھہ تبادلہ کے لیے اصرار کیا۔

علی پور چٹھہ واپسی کی کوشش

میں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا1999-01-24 کو میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ریجنل آفس گوجرانوالہ آیا تو وہاں کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جناب سہیل نذیر رانا صاحب نے مجھے نیو پی ٹی اوسی کی 5 روزہ تربیتی ورکشاپ کے لیے لاہور کیمپس جانے کو کہا۔ میں نے حامی بھر لی۔ انھوں نے مجھے لیٹر دیا۔ میں نے لاہور آکر حاضری دی اور واپسی پر DPI آفس لاہور اپنے علی پور چٹھہ کالج میں ایڈجسٹمنٹ کیس کا پتہ کیا۔معلوم ہوا کہ علی پور چٹھہ کے پرنسپل نے اس کیس کو بغیر کاروائی فائل کروا دیا ہے چونکہ میرے پاس کیس کی ایک کاپی موجود تھی میں وہ لے کر سول سیکرٹریٹ آیا وہاں مجھے لیکچررز ایسوسی ایشن کے لیڈر پروفیسر ماجد وزیر صاحب ملے۔ میں نے ان سے بات کی۔انہوں نے مجھے بتایا چونکہ آپ کی 17 ویں سکیل کی سیٹ پر لیکچرر کی پوسٹنگ ہو چکی ہے۔اس لیے آپ کی کنورشن (Convertion) نہیں ہو سکتی۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ کوئی آسمانی صحیفہ نہیں ہے جس میں تبدیلی ناممکن ہے۔ میں سیکرٹری صاحب ہائر ایجوکیشن کے پاس ان سے ملاقات کے لیے اندر چلا گیا تین چار اصحاب پہلے سے کھڑے گفتگو میں محو تھے۔ میں جاتے ہی ایک کرسی پر یہ کہتے ہوئے (Sorry I con't Stand) بیٹھ گیا۔سیکرٹری نے فرمایا ''ہاں آپ وڈیرے ہیں آپ تشریف رکھیں۔'' اور آپ کی درخواست کدھر ہے؟'' میں نے کہا جناب آپ کے سامنے آپ کی میز پر اُنہوں نے درخواست پر لکھا "PI Resolve" اور مجھے کہا کہ ''آپ یہ ایڈیشنل سیکرٹری

کے پاس لے جائیں‘‘میں درخواست لے کر پروفیسر شاہدہ ملک صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔درخواست ان کے سامنے رکھ کر کہا کہ بیٹا سنا ہے کہ’’جا بیٹا راوی نہ کوئی آوی تے نہ کوئی جاوی‘‘۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی پرموشن اتنی لیٹ کیوں ہوئی ہے۔میں نے عرض کیا کہ 24 سال سکول سائیڈ میں گزارے ہیں۔انہوں نے درخواست کے اوپر "So, Isue orders" لکھا اور مجھے کہا کہ’’میں نے آپ کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کردی ہیں۔آپ SO کے پاس لے جائیں اور آرڈر جاری کروالیں۔میں درخواست لے کر SO صاحب کے پاس آیا۔انہیں درخواست دی وہ صاحب کبھی اس کے ریمارکس کو دیکھتے اور کبھی مجھے، مجھے کہا کہ درخواست میرے سٹینو کے پاس لے جائیں۔میں سٹینو صاحب کے پاس آیا درخواست انھیں دے دی اور ان سے پوچھا کہ بھئی میں آرڈرز لینے کب آؤں؟انہوں نے’’پرسوں‘‘کہا۔لیکن میں نے انہیں کہا کہ میں’’ترسوں آؤں گا‘‘یہ کہا اور واپس علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ریجنل کیمپ رضا بلاک آ گیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔تین دن کے بعد سیکرٹریٹ گیا۔SO صاحب سے ملا انھوں نے میرے استفسار پر کہا کہ آپ کا تبادلہ اور کنورشن نہیں ہو سکتی کیونکہ اس وقت آپ علی پور چٹھہ کے بجائے شکرگڑھ میں ہیں۔مَیں نے انہیں جواباً عرض کیا کہ جناب جب میں نے درخواست دائر کی تھی تو اس وقت علی پور چٹھہ میں تھا۔آپ میڈم صاحبہ سے ہدایت حاصل کرلیں۔چنانچہ SO صاحب نے میڈم صاحبہ سے فون پر بات کی۔انہوں نے کہا کہ پہلے آپ کنورشن کریں اور پھر ٹرانسفر 09-01-1999 کو SO صاحب سے سارے متعلقین کی آرڈرز کی کاپیاں حاصل کیں۔نمبر لگوائے اور خوشی خوشی وہاں سے نکل کر شام کو علی پور چٹھہ ڈاکٹر محمد اقبال کے ہاں آیا۔پروفیسر اشفاق احمد صاحب کو بلا کر ان سے جائننگ رپورٹس تیار کرا کر ہم تینوں پرنسپل صاحب کے پاس کالج پہنچے وہ تو ہمیں دیکھ کر پریشان ہوگئے اور پسینے چھوٹ گئے۔میں نے ان سے پوچھا کہ جناب اگر سیکرٹری صاحب کی طرف سے میری ایڈجسٹمنٹ/ٹرانسفر کے احکام آجائیں تو آپ کیا کریں گے۔کہنے لگے کہ پہلی بات تو یہ ہے اب آپ کی جگہ پر لیکچرر کی تعیناتی ہوچکی ہے۔تو میں نے انھیں آرڈرز کی کاپی تھما دی تو وہ حیران رہ گئے اور کہا کہ اب لیکچرر کا کیا بنے گا؟ میں نے بتایا کہ یہ ڈائریکٹر صاحب کالجز گوجرانوالہ ڈویژن کی خدمت میں ان کی ڈسپوزل پر بھیجے جائیں گے جناب ڈائریکٹر انہیں کسی اور کالج میں بھیج دیں گے۔میں نے انہیں اپنی 01-02-1999 کی جائننگ اور ان صاحب کی فراغت اور ڈسپوزل کا لیٹر بنا کر دے دیا۔میری حاضری رپورٹس پر پرنسپل سیال صاحب نے طوعاً وکرھاً دستخط ثبت کیے وہ تو پریشان تھے کہ میں تو ان کا کیس DPI آفس لاہور میں فائل کروا آیا تھا۔میرے مرشد نے ہدایت کی تھی کہ’’اک جواں مردی ہئی آ‘‘اینوں مرن دے۔اینوں واپس نہ لینا‘‘ہم تینوں وہاں سے واپس ڈاکٹر صاحب کے ہاں آئے۔میں نے انہیں ساری کہانی سنائی۔شب بسری کی اور اگلے روز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے لاہور اختتامی اجلاس میں شرکت کی۔وہاں سے فارغ ہوکر شکرگڑھ کالج آیا اور 31-01-1999 کو جناب پرنسپل غلام سرور غزالی کو آرڈرز کی کاپی دے کر خط فراغت حاصل کیا تو وہ بھی منہ میں انگلی

ڈال کر سوچ میں پڑ گئے اور کہا کہ میرے کالج کے چار لیکچررز کی پروموشن ہو چکی ہے لیکن ابھی تک ان کی ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو پا رہی اور میں ان سے فراغت حاصل کرنے کے بعد نارووال ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفیسر نارووال کے دفتر میں متعلقہ کلرک کو خط فراغت اور آرڈرز کی کاپی دی اور LPC اور GPE کے حساب کی کاپی کے لیے کہا اس نے کہا کہ آپ کو علی پور چٹھہ بھیج دوں گا۔

علی پور چٹھہ حاضری

میں دو ماہ بعد یکم فروری 1999 کو پھر علی پور چٹھہ کی فضاؤں میں تعلیمی سرگرمیوں میں محو ہونے کے لیے اپنے محبوب پروفیسر صاحبان کے درمیان موجود ہونے کے لیے حاضر ہو گیا اور اسی کالج میں سکول سائیڈ کی طرف سے بطور لیکچرر اُردو پروفیسر نذر حسین صاحب کوٹ نکوی میرے راستے میں سفر کرنے والے دوسرے پروفیسر تھے۔ میرے تمام دوست احباب شاد کام تھے۔ ڈاکٹر محمد اقبال تو پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کی یہ زبردست خواہش تھی کہ میں اسی کالج میں سے اپنی عمر طبعی کے 60 ویں سال ریٹائرمنٹ حاصل کروں جو اللہ رب العالمین نے پوری کر دی۔ چنانچہ میں کالج کے معمول کے کام میں مصروف ہو گیا۔

ریٹائرمنٹ

اللہ رب العالمین کے فضل وعنایت سے 28 اکتوبر 1999ء کو وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب میری عمر طبعی ساٹھ سال ہو رہی تھی۔ کالج کے شریف النفس مخلص اور قدر دان پرنسپل پروفیسر محمد یونس مفتی نے میرے گلے میں ہار ڈالا اور مجھے سٹاف کے جلوس سر سبز تقریب گاہ میں لائے۔ طلبہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ پروفیسر نذر حسین صاحب سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پہلے طلباء نے اظہار خیال کیا کہ میاں صاحب واحد پروفیسر تھے جو ہمیں گراؤنڈ میں یا کہیں بھی فارغ بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور ہمیں ڈانٹ کر کلاسوں میں بھیجا کرتے تھے۔ وہ ہمیں خالی کلاسز میں بھی مصروف رکھا کرتے تھے۔ اساتذہ کرام نے میرے ہمراہ بیتے لمحوں کی داستان کی جُستہ جُستہ خوشگوار یادیں پیش کیں۔ میں نے بھی اظہار خیال کے دوران انہیں اپنے فرائض پوری تن دہی اور عرق فشانی سے انجام دینے کے لیے گزارش کی اور کہا کہ آج میں بہت مسرور ہوں کہ میں نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں برتی اور یہ خدمت میرا فرض تھا جسے میں نے نبھایا اور خوب نبھایا۔ یہ پرائمری سکول کی ملازمت اس کی ابتدائی منزل تھی اور کالج ملازمت اس کی آخری منزل اپنی انتہا کو بخیر وخوبی بہ فضل رب کریم پہنچی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا اظہار میری والہانہ محبت کے اظہار سے مختلف تھا۔ محترم پرنسپل نے رفقاء کرام کے سامنے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا اور جملہ اساتذہ کرام کی طرف سے میری سابقہ خدمات کو سراہتے ہوئے مجھے کالج کا اثاثہ اور Mr.

Chips قرار دیا۔ میں نے اس عزت افزائی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں لذت کام و دہن کے لیے بہترین اور یادآفرین لذیذ دعوت طعام کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سٹاف کی طرف سے مجھے یادگاری سیاہ ویسکوٹ اور طلباء کی طرف سے تاج کمپنی لاہور کا بڑی تختی پر تحریر قران عظیم کا گرانقدر نسخہ دیا گیا۔ ریٹائرمنٹ کی یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

اس یادگار اختتام ملازمت کی پرلذت دعوت کے اثرات کو ساتھ لے کر شام کو جلال پور اہل خانہ کے پاس ان کے جلو میں مسرور فروکش ہو گیا۔ کالج ملازمت کے دوران 15 مرتبہ امتحان انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے امتحانی مراکز کا سپرنٹنڈنٹ، 6 مرتبہ میٹرک اسلامیات لازمی کا پیپرسیٹر، 6 مرتبہ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کا پیپرسیٹر، 2،2 سال پر محیط دو مرتبہ ممبر اکیڈمک / نصابی کمیٹی (تا حال) اور 1989ء سے تا حال امتحان میٹرک سالانہ کا موبائل انسپکٹر اور بعد از ریٹائرمنٹ دونوں امتحانوں کا تا حال موبائل انسپکٹر کے طور پر تعلیمی بورڈ کی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ جو میری فرض شناسی، راز داری اور کام سے لگن کا مظہر ہے۔ ساڑھے تین سال تک علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا ضلعی رابطہ کار رہ چکا ہوں اور تا حال ایم اے ایجوکیشن، ایم ایڈ، بی ایڈ اور بی اے کے ٹیوٹر کے طور پر خدمات انجام دے رہا ہوں۔

موجودہ پرنسپل ادارہ جناب پروفیسر محمد ارشد جاوید اپنی شفقت سے اور مخلصانہ دعوت سے کبھی کبھار گزشتہ یادوں کو تازگی بخشنے کے لیے تقریبات میں مدعو کر لیتے ہیں جس پر میں ان کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ کریم انہیں اجر عظیم سے نوازے اور ان کے رفقا کو بھی اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش آباد رکھیں۔

آتے ہیں یاد بیتے ہوئے ایام
کاش یہ رہتے یونہی مدام

وفات

پروفیسر عبد الرحمٰن قاصر اپنی زندگی کی 80 بہاریں دیکھنے کے بعد 25 اگست 2019 کو داعی اجل کے سپرد ہو گئے (آخری لائن کا اضافہ میری طرف سے کیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایڈیٹر اُردو سیکشن)

☆......☆

☆ اللہ کی طرف آجاؤ، اس سے پہلے کہ اللہ تمھیں اپنی طرف بلا لے۔

☆......☆

استاد ''دانش''، شاگرد ''دیوانہ''!

رائے ارشاد اللہ کمال ایڈووکیٹ

کئی برس ہوئے ہیں، میں نے بطور ایڈیٹر مجلّہ ''الحفیظ'' کے لیے حافظ آباد کی تاریخ سے متعلق مضمون ''دشت میں ایک شہر'' سپردِ قلم کیا تھا۔ خوش قسمتی سے باندازِ دیگر ایک بار پھر مجھے اسی موضوع کو نبھانا پڑ گیا ہے۔

غالباً 1993 کی بات ہے میں گورنمنٹ ڈگری کالج حافظ آباد میں بطور استاد آیا اور مضمون میرا اُردو تھا۔ اہلِ قلم کی تلاش اور ان سے ملاقات میرا ہمیشہ سے شوق رہا ہے۔ میرے ایک دوست بتایا کرتے تھے کہ حافظ آباد میں ریلوے روڈ پر ایک چوبارہ میں اُردو زبان کے مایہ ناز ادیب و شاعر اور درویش صفت انسان استاد احسان دانش مرحوم کے شاگرد خاص جاوید حیات جن کا تخلص اُستادِ محترم مذکور کی تجویز پر ''دیوانہ'' ٹھہرا، ہوا کرتے ہیں۔

میں ایک روز ان سے ملنے کے لیے گیا کہ دل وہیں چھوڑ آیا اس کے بعد سفرِ آخرت تک ان کی شفقت و مروّت کی بانہوں میں رہا۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ ماں کی دعاؤں کی طرح مخلص تھے۔ دلچسپ، ملنسار، معصوم اور دلنواز! بس مسلسل مسکراتے جاتے اور دل کی ہر بات بے تکلفانہ نوکِ زبان پر لے آتے۔ جو ان سے کبھی نہیں مل پایا۔ اس نے گویا تبسم خلوص نہیں دیکھا۔

آخری عرصہ میں استاد دانش مرحوم انارکلی لاہور کی بغل میں سکونت پذیر رہے۔ اس مکان پر ''دانش کدہ'' کا بورڈ آویزاں تھا۔ دانش کدہ کی اصطلاح میں کمال ذو معنویت پائی گئی ہے۔ ایک ان کے نام دانش کی رعایت، دوسرا لغوی مفہوم کے لحاظ سے دانش کا مقام اور سکونت! میں ایک دو مرتبہ ان کے نقشِ پا کی تلاش میں وہاں بھی حاضر ہوا اور ماضی کو آواز دے کر جگا لیا۔ کیا ہوا جو ان کی ظاہری حیات میں کبھی نہ جا پایا۔ بعد میں گیا تو بھی ان کا مسکن زندگی سے جگمگاتا ملا۔ واقعی مکیں کبھی مکاں سے جدا نہیں ہوتا۔ مجھے ان کے ایک نیک نام پوتے خوش آمدید کہا کرتے تھے۔

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ استاد احسان دانش مرحوم حسباً نسباً سیّد تھے، مگر نام کے ساتھ لاحقہ و سابقہ کی حیثیت سے یہ نسبت کبھی لکھی نہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہم اس اہل کہاں؟ ایک بار ان کے بیٹے شاہد فیضان نے ایسا کیا تو سخت ناراض ہوئے اور کہا نام کے ساتھ یہ لکھنے کو منہ چاہیے! عجب ہے کہ جب ''آؤ سید بنتے ہیں'' کی ایک باقاعدہ تحریک منصۂ شہود بلکہ وجود میں آ چکی تھی۔ ہر ایرا غیرا اور نتھو خیرا اپنے تئیں سیّد کہلواتا پھرتا ہے۔ تو ایک خالص النسل نے اس امر و عمل سے تا زندگی گریز

کیا۔ جبکہ اب بازار میں ہر قسم کے سیّد بھی ملتے ہیں۔

استاد احسان دانش مرحوم کی بات چل نکلی ہے تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس نے ان کی سوانح عمری ''جہان دانش'' نہیں پڑھی اس نے کیا پڑھا؟ ایک بہت بڑی دولت سے محرومی! ''جہان دانش'' زندگی کے نشیب و فراز میں گرتوں کو تھام لیتی، گرم سرد تھپیڑے برداشت کرنے کا حوصلہ بخشتی، ناکامیوں اور محرومیوں سے کبھی نہیں گھبرانے دیتی۔ یہ نوجوان بالخصوص طالب علموں کے لیے ایک خاص تحفہ ہے۔ اس کا دوسرا حصہ ''جہان دیگر'' بھی معرکے کی چیز ہے۔ اس میں جاوید حیات دیوانہ صاحب کا بھی ذکر خیر ہے۔

مجھے یاد آیا کہ مختار مسعود نے کہیں لکھا ہے کہ مچھلی کو تیل میں ڈالنے پر جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کے لیے اردو ترکیب چاہیے تھی، جو تلاش بسیار کے باوجود کہیں سے اور کسی سے نہ ملی تو ایک روز میں نے ''دانشکدہ'' پر دستک دی۔ سوال تمنا پیش کیا تو انہوں نے بیساختہ فرمایا ''شراٹا'' کہہ لیجئے۔ مختار مسعود بلا کا باشعور و سلیقہ بند لکھاری ہے۔ کچھ عرصہ قبل جام فنا پیا۔ ان کی تین کتب بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آواز دوست۔ سفر نصیب۔ لوح ایام۔ مسئلہ مگر یہ ہے کہ ان کے مطالعہ کو علم و عمر میں ایک ذرا پختگی چاہیے!

احسان دانش ایک خوبصورت، مست الست، خود ساز اور صحیح معنوں میں بڑے انسان تھے۔ بڑا انسان عہدوں، دولت، اقتدار و اختیار یا پروپیگنڈہ سے نہیں بنتا اس کا تعلق علم و کردار اور خدمت خلق سے ہے۔ ان کی خوبصورتی کا کیا کہیے۔ ادیب، شاعر، متوکل، درویش، استاد اور ماہر لغات و لسان! ان کی نظم و غزل کا سفر و سلسلہ بھی خوب ہے۔ فطرت نگاری اور قادر الکلامی اللہ اللہ۔

ریلوے روڈ حافظ آباد پر ان کے شاگرد رشید بابا جاوید حیات دیوانہ کا سادہ سا مطب بھی ضلع حافظ آباد کی حد تک ایک دانشکدہ ہی تھا۔ بابا جاوید حیات دیوانہ موضع کوٹ چیاں کے پھلروان ملک ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے سفر زندگی کا آغاز نہایت دگرگوں حالات میں کیا بمشکل چار جماعت پڑھ پائے۔ آگے ان کے خاندانی وسائل اجازت دیتے تھے نہ مقامی ماحول! لیکن فطرت نے ان کے اندر کبھی سرد نہ ہونے والی ایک چنگاری رکھی ہوئی تھی یہ پہلے شرارہ بنی، پھر آتش اور اس کے بعد آتش فشاں! ایک بار انہوں نے ترنگ میں مجھے بتایا۔ میں چرواہا تھا دن بھر آبادی سے دور مال مویشی ہانکتا رہتا۔ کسی رسالے میں احسان دانش کے بارے میں ایک جامع مضمون پڑھا جس میں لکھا تھا کہ ان کی تعلیم چار درجہ سے آگے نہیں بڑھی۔ وہ اب جو کچھ بھی ہیں اپنی لگاتار محنت سے ہیں جہد مسلسل! لطف ہے کہ حصہ پرائمری سے آگے نہ پڑھنے والا طالب علم پہلے استاد بنا پھر استاذ الاساتذہ۔ کتنوں نے ان کے قدموں میں بیٹھ کر قلم پکڑنا سیکھا، مقالہ جات لکھے، شاعر و ادیب ہوئے اور بڑے بڑوں نے پی ایچ ڈی کے لیے استفادہ و استفاضہ کیا۔

بات، استاد دانش مرحوم کے انٹرویو سے چلی تھی، جو حافظ آباد کے ایک دور افتادہ پسماندہ گاؤں میں رہنے والے نوعمر چرواہے نے پڑھا اور افتادِطبع کے ہاتھوں مجبور انہیں خط میں اپنے حالات و اشتیاق لکھ کر بھول گیا۔ چند دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک بزرگ پہلے ان کی بستی میں اور پھر پوچھتے پچھاتے ان کے پاس باہر آ گئے۔ جہاں یہ مال چرا رہے تھے۔ یہ احسان دانش مرحوم تھے۔ ایک بہت بڑا انسان، چھوٹے کی تلاش میں نکلا!

بتاتے تھے کہ ان کی تحریک پر جلد ہی میں ان کی زیرِسرپرستی لاہور چلا گیا۔ انہوں نے مجھے لکھنے پڑھنے کے ساتھ روزگار بھی مہیا کیا یہ جو میں بعض امراض مخصوصہ کے تیر بہدف نسخے رکھتا ہوں، ان کی عنایت ہیں وہ قبلہ احسان دانش کے ان گنت احسان اور قصہ ہائے دانش سنایا کرتے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک پرلطف، روح پرور، سبق آموز اور یادگار!

احسان دانش مرحوم کیا تھے؟ وہ کیا نہیں تھے۔ بلبل ہزار داستان، سات سروں کا بہتا دریا، ہنستا مسکراتا چمنستان! ہر رنگ دلکش! موصوف پر بھی ان کا کافی سے زیادہ عکس تھا۔ بابا جی جاوید حیات کی تربیت گاہ میں وہ کون سا باذوق شخص، یا سخن نواہے جو آیا یا نہیں بلایا گیا۔ ان کی محبت ہی محبت تھی ان کے دم سے شہر دشت میں ایک ادبی فضا قائم تھی شاید ہی کسی دن غیر رسمی محفل مشاعرہ نہ سجی ہو! طالب علم، استاد، افسانہ نویس، صحافی غرضیکہ تمام شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے ان کے گرویدہ تھے۔ اوزان و بحور میں مہارت تامہ تھے۔ نوآموز لکھنے والوں کا دل بڑھاتے اور پختہ کاروں کو بھی اصلاح دیتے، ان کے فیض صحبت سے پورے علاقہ نے فائدہ اٹھایا افسوس مگر یہ ہے کہ عموماً لوگوں نے ان کی قدر نہیں جانی۔ زندگی میں بہتوں نے شاعرانہ وادیبانہ فضا کو فرقہ واریت کے زہر سے آلودہ کیے رکھا اور بعداز ''حیات'' احسان فراموشی کا عالم ہے۔ انہوں نے بلا تفریق سب کو نوازا، لیکن اب بھی کوئی ان کی شفقت وتربیت کو بیان میں نہیں لاتا۔ ایسے ویسے ''شاہدولہ کے چوہوں'' کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان کے نام گنوا کر لیکن میں سرگزشت کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا!

بابا جاوید حیات کے چوبارے پر ایک طرف نشست گاہ تھی دوسری طرف اصطلاح عام میں کلینک! حکیم بھی کہلواتے تھے۔ بعض ''نسخوں'' جو حضرت احسان دانش کی عطا تھے سے بڑا نام کمایا۔ بابا جی کی ادبی بیٹھک میں چائے پر چائے کا دور چلتا، کسی کی طلب پر سموسہ آتا تو کوئی ناشتے کا کہہ دیتا۔ بعض تو صرف کھانے پینے آتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو ان کو واقعی ''دیوانہ'' سمجھا کیے۔ حالانکہ وہ اصل میں فرزانہ تھے۔ اس کا ادراک خود انہیں بھی تھا۔ فرماتے، میرے پاس آنے جانے والے اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے میں ان کے کرتوت نہیں سمجھتا لیکن کیا بتاؤں کہ جانتے بوجھتے آنکھ بند کر لینے میں بھی قدرت نے ایک مزا رکھا ہے۔ آپ جانتے ہوں اور لوگ یہ نہ جانتے ہوں کہ آپ جانتے ہیں۔ اس کی کیفیت میں انوکھا لطف ہے۔ کم وسائل کے باوجود ان کا دسترخوان وسیع تھا اور دل وسیع تر۔

بابا جاوید حیات صاحب کے دو شعری مجموعے بھی زیورطبع سے آراستہ ہوئے ایک زمانے میں بچوں کا رسالہ ''کہانی

نگر'' شائع کرنا شروع کیا جو ماہانہ چھپتا۔ مگر اس نے عمر صرف ایک برس پائی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک حقیقی بڑا انسان دولت اور جھوٹی شہرت کے پیچھے نہیں دوڑ سکتا۔ وہ تو اعلیٰ انسانی اقدار کی ٹھنڈی چھاؤں میں جیا کرتا ہے۔ نتیجتاً بے زری اسے مار دیتی ہے۔ جو سینہ خاک پر بوجھ ہوا کرتے ہیں وہ معتبر بن بیٹھتے ہیں اس کے باوجود مگر کون مال و زر کی جستجو میں صبح و شام زندگی برباد کرے۔

بابا مرحوم سے بعض مطبوعہ فنی رسائل بھی یادگار ہیں۔ سر سنگیت اور اوزان و بحور سے متعلق گہرا ادراک رکھتے۔ واقعی اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان کی حیات مستعار میں ناگوار واقعات کی پے در پے یلغار آئی۔ مگر عموماً استاد دانش مرحوم کا یہ شعر گنگنا کر چپ سادھ لیتے۔

زخم پہ زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں!

ان کی علمی و ادبی خدمات بے بہا ہیں۔ انسانیت نوازی، دوست پروری، آہ! موت سے کس کو رستگاری ہے۔ چند برس قبل ایک روز چپ کی چادر اوڑھ کر سو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چنگاری بجھ گئی ان کی آخری آرام گاہ گاؤں کے قبرستان میں واقع ہے۔ جہاں سے سفر شروع ہوا تھا بالآخر وہیں ختم ہوا۔ ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا'' کے مصداق اس موڑ پر استاد احسان دانش کا آخری شعر یاد آ گیا۔ جو بعد وفات ان کے سرہانے تلے موجود تھا۔

عادت ہے مجھے گھر میں نماز شام پڑھنے کی
دفنانا ذرا مجھ کو نماز شام سے پہلے

استاد جاوید حیات دیوانہ بھی مغرب سے قبل لحد میں اترے انہیں بھی تو اپنے گھر ہی نماز پڑھنے کی عادت تھی۔

عجب ہے کہ میں بابا جی مرحوم کی یاد میں چند تمہیدی کلمات سے آگے ڈاکٹر منظور الحق مخدوم کی نعت گوئی پر لکھنا چاہتا تھا۔ جو حسرت ہی رہ گئی ڈاکٹر صاحب قبلہ سے ''تاجدار حرم'' یادگار ہے۔ ایک ناقابل فراموش بلکہ زندہ و تابندہ دیوان نعت! ڈاکٹر مرحوم و مغفور کی نسبت پاکستان میں نعت کے موضوع پر سب سے زیادہ تحقیقی و تخلیقی کام کرنے والے راجا رشید محمود نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کہ اگر یہ شخص حافظ آباد کی بجائے لاہور میں مقیم ہوتا اور مستقل لکھتا۔ تو اس عہد کا سب سے بڑا نعت گو قرار پاتا۔ ایک بڑے نعت گو تو یہ اب بھی ہیں اس دعویٰ پر ایک ناقابل تردید ثبوت منفرد مجموعہ نعت ''تاجدار حرم'' ہے۔

ے تیرا ''منظور'' نظر ہر کس و ناکس تو نہیں
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

ے عکس جمال ذات خدا بے گماں ہیں آپؐ
خود تو خدا کی ذات ہے مخفی عیاں ہیں آپؐ

ے مجھ کو دنیائے تصور کا مکیں رہنے دو
یہ رہا روضہ سرکار یہیں رہنے دو

ے انؐ کی دہلیز پہ رکھی ہے جبیں رہنے دو
اور کچھ دیر مجھے عرش نشیں رہنے دو

ے داور محشر میرا نامہ اعمال نہ دیکھ
میں ہوں ناداں تو کوئی بات لیے پھرتا ہوں

ے سارے فرماں رواؤں کا فرمانروا تو، سوائے خدا کے ہے سب سے بڑا
سرفرازوں کے سر تیری دہلیز پر! انکسار سے خم، تاجدار حرم!

عرش پر فرش پر، ہر کہیں، ہر کجا، ذکر جاری و ساری تیرے نام کا
تذکرہ ہے تیرا کوبہ کو، سوبہ سو، جابہ جا، دم بہ دم، تاجدار حرم

تیرا ناقد سعادت سے محروم ہے، تیرا ادنیٰ ثناخواں بھی مخدوم ہے
جو تیری نعت کی بات کہتا رہے کر عطا وہ قلم، تاجدار حرم

نظم و غزل
(اُردو و پنجابی)

نعت سرورکونین صلعم

پروفیسر سید فرمان رضا نقوی

اے مسیحا! مرے احسان بس اتنا کر دے
مردہ احساس مسلمان ہیں زندہ کر دے

تیرے دیدار کی ہے دل میں تمنا آقاؐ
میں مٹا جاتا ہوں آ ، پوری تمنا کر دے

میں مس خاک ہوں اے سارے رسولوں کے امامؐ
اپنے حسنینؑ کے صدقے مجھے ہیرا کر دے

باعث خلقتِ مخلوق بحقِ زہراؑ
مرے ہر بگڑے ہوئے کام کو سیدھا کر دے

اپنے اصحابؓ کے صدقے میں مرے پیارے حضورؐ
مجھ گناہگار کو بس پست سے بالا کر دے

خالق ارض و سما سے ہے یہی میری دعا
دہر میں اسم محمدؐ سے اُجالا کر دے

ظلمت شب ہے سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
میری دنیا میں ذرا نور اُجالا کر دے

میں ہوں سوکھے ہوئے اک پیڑ کی صورت نقوؔی
اک نظر ڈال کے مجھ پر مجھے سبزہ کر دے

نعت رسول مقبول ﷺ

وقار احمد وقار

میرے دل کی صدا مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ
رب سے اک ہی دعا مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

عاشقوں کو تو بس ہر گھڑی چاہیے
رحمتوں کی عطا مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

اب ہے تسکین جاں کو یہی آرزو
خواب میں یا خدا مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

گنبد سبز میری نگاہوں میں ہو
لب پہ صلّے علی مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

پڑھ کے کلمہ شہادت جو دیکھو ابھی
رب سے ہیں کیا جدا مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

اور کوئی وظیفہ نہیں کام کا
رُوح کی ہے غذا مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

یہ وبائیں مجھے کیا ڈرائیں گی اب
کہ مرا آسرا مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

☆......☆

غزل

خالد محمود رامے

دل نے کب حوصلوں کو ہارا تھا
پہلا پتھر ہی اُس نے مارا تھا

اوّلِ شب جو ٹوٹ کر بکھرا
وہ مرے بخت کا ستارا تھا

سنگ بننا بھی تھا قبول مجھے
کب کسی نے مجھے پکارا تھا

سب سے پہلے اُسی نے چھوڑ دیا
سب سے پہلا ہی جو سہارا تھا

کس کے ہونٹوں کی بند کلیوں پہ
کب کہاں نام بھی ہمارا تھا

مات ہونا ہی تھا مجھے خالدؔ
میں اکیلا، جہان سارا تھا

☆......☆

غزل

پروفیسر سید فرماں رضا نقوی

کس طرح نغمہ سرا ہوں زندگی کی تال پر
موت ہے پیش نظر گریاں ہوں اپنے حال پر
ہوں خجل حد سے سوا میں اپنے ہی اعمال پر
میرے عصیاں محو گریاں ہیں میرے احوال پر
زلف پیچاں کے تصور نے کیا مجھ کو نڈھال
گو نظر پہنچی نہیں میری ہے اُن کے بال پر
زندگی بڑھتی ہے جتنی اتنی گھٹ جاتی ہے روز
کس قدر حیراں ہوں میں اس کی انوکھی چال پر
وقت کی رفتار پر ٹیپو کا خون مہنگا پڑا
ایک دن کو فوقیت دینا پڑی سو سال پر
ہر کس و ناکس کو یکساں ریٹ پر ملتی رہی
ورنہ پابندی لگے چینی کے استعمال پر
یوں چلی مرحب کے سر پر ذوالفقار حیدری
نے پرِ جبرئیل پر ٹھہری نہ اس کی ڈھال پر
اس لیے جبرئیل آگے اک قدم بڑھتے نہیں
اک قدم بڑھنے سے آگ جل نہ جائیں بال پَر
گلشن زہراؑ تو اُجڑا کربلا کے دشت میں
موت بھی رونے لگی واں سیدوںؑ کے حال پر
بے طلب آیا ہے نہ کوئی گر کسی کو ہو خیال
بندہ پرور میں یہاں آیا ہوں کال پر

غزل

محمد ارشد اقبال کوکبؔ

پدر کے گھر میں بیٹھی بیٹیاں اچھی نہیں لگتیں
بنا شوہر کے تنہا بیویاں اچھی نہیں لگتیں
میری یادوں کے لالہ زار میں تری خزاں ایسی
چمن زاروں میں اُڑتی تلیاں اچھی نہیں لگتیں
کسی متنازعہ قضیے کو سلجھاؤ دلائل سے
یونہی آپس میں بے جا تلخیاں اچھی نہیں لگتیں
تجھے کہنا ہے جو محفل میں سب کے رُوبرو کہ دو
یہ کانا پھوسیاں، سرگوشیاں اچھی نہیں لگتیں
اثاثہ ہیں ہمارا ان کی تربیت ضروری ہے
مگر بچوں پہ بے جا سختیاں اچھی نہیں لگتیں
صرف عزمِ سفر ہی شرط ہے بس کامیابی کی
کمر باندھو کہ اب مایوسیاں اچھی نہیں لگتیں
فضا مسموم ہے خلق خدا دست و گریباں ہے
تو ایسے وقت میں یہ مستیاں اچھی نہیں لگتیں
میاں بیوی رفیقِ زندگی ہیں بالیقین کوکبؔ
ہوئی ان میں کبھی ناچاقیاں اچھی نہیں لگتیں

دعا

انتخا :ملک محمد رضوان پھلرواں
(ایم۔اے سال دوم)

رات جی کھول کے پھر میں نے دعا مانگی ہے
اور اک چیز بڑی بیش بہا مانگی ہے
اور وہ چیز نہ دولت، نہ مکاں ہے، نہ محل
تاج مانگا ہے، نہ دستار و قبا مانگی ہے
نہ تو قدموں کے تلے فرش گہر مانگا ہے
اور نہ سر پر کلہِ بال ہما مانگی ہے
نہ شریک سفر و زاد سفر مانگا ہے
نہ صدائے جرس و بانگِ درا مانگی ہے
نہ سکندر کی طرح فتح کا پرچم مانگا
اور نہ مانندِ خضر عمر بقا مانگی ہے
نہ کوئی عہدہ نہ کرسی، نہ لقب مانگا ہے
نہ کسی خدمتِ قومی کی جزا مانگی ہے
نہ تو مہمان خصوصی کا شرف مانگا ہے
اور نہ محفل میں کہیں صدر کی جا مانگی ہے
نہ تو منظر کوئی شاداب و حسیں مانگا ہے
نہ صحت بخش کوئی آب و ہوا مانگی ہے
محفل عیش نہ سامانِ طرب مانگا ہے
چاندنی رات نہ گھنگور گھٹا مانگی ہے
بانسری مانگی، نہ طاؤس، نہ بربط، نہ رباب

نہ کوئی مطربہ شیریں نوا مانگی ہے
چین کی نیند، نہ آرام کا پہلو مانگا
بختِ بیدار، نہ تقدیر رسا مانگی ہے
نہ تو اشکوں کی فراوانی سے مانگی ہے نجات
اور نہ اپنے مرض دل کی شفا مانگی ہے
سن کے حیران ہوئے جاتے ہیں اربابِ چمن
آخرش! کون سی پاگل نے دعا مانگی ہے
آ! ترے کان میں کہہ دوں اے نسیمِ سحری!
سب سے پیاری مجھے کیا چیز ہے؟ کیا مانگی ہے
وہ سراپائے رحم گنبد خضری کے مکیں
ان کی غلامی میں مرنے کی دعا مانگی ہے
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

گزرا زمانہ

انتخاب: امیر حمزہ
(سال سوم)

بہت یاد آتا ہے گزرا زمانہ
وہ گاؤں کی گلیوں میں پیپل پرانا

وہ باغوں میں پیڑوں پہ ٹائر کے جھولے
وہ بارش کی بوندوں میں چھت پر نہانا

وہ املی کے پیڑوں پہ پتھر چلانا
جو پتھر کسی کو لگے بھاگ جانا

چھپا کر کے سب کی نظر سے ہمیشہ
وہ ماں کے دوپٹے سے سکے چرانا

وہ سائیکل کے پہیے سے گاڑی بنانا
بڑے فخر سے دوسروں کو سکھانا

وہ ماں کی محبت وہ والد کی شفقت
وہ ماتھے پہ کاجل کا ٹیکا لگانا

وہ کاغذ کی چڑیا بنا کر اڑانا
وہ پڑھنے کے ڈر سے کتابیں چھپانا

وہ نرکل کی قلموں سے تختی پہ لکھنا
وہ گھر سے سبق یاد کر کے نہ جانا

وہ گرمی کی چھٹی مزے سے بتانا
وہ نانی کا قصہ کہانی سنانا

وہ گاؤں کے میلے میں گڑ کی جلیبی
وہ سرکس میں خوش ہو کے تالی بجانا

وہ انگلی چھپا کر پہیلی بجھانا
وہ پیچھے سے ''ہو'' کر کے سب کو ڈرانا

وہ کاغذ کے ٹکڑوں پہ چور اور سپاہی
وہ شادی میں اڑتا ہوا شامیانہ

مگر یاد بچپن کہیں سو گئی ہے
کہ خوابوں کی جیسے سحر ہو گئی ہے

یہ نفرت کی اندھی عداوت کے شعلے
یہ سیاست دلوں میں زہر ہو گئی ہے

زباں بند رکھنے کا آیا زمانہ
لبوں پہ نہ آئے امن کا ترانہ

☆......☆

پو EM ئم PO

محمد ولایت رضا (سابقہ طالب علم)

میرے دلبر مجھ سے Hate نہ کر
بند آس امید کے Gate نہ کر
دشمن کو Nominate نہ کر

میری کل کائنات کے Best صنم
صدمات ہوئے میرے Guest صنم
میری چاہت نہ کر Test صنم

تو چاہے مجھ کو Gift نہ کر
دیدار کی کوئی Shift نہ کر
پر غیر کو ہرگز Lift نہ کر

میرے پیار کا سستا Rate نہ کر
میرے دلبر مجھ سے Hate نہ کر
بند آس اُمید کے Gate نہ کر

غزل

شعیب احمد مانگٹ
ایم۔اے سال دوم

کب محبت سے دیکھتے ہیں مجھے
سب ضرورت سے دیکھتے ہیں مجھے

میرا نیندوں کے ساتھ جھگڑا ہے
خواب حسرت سے دیکھتے ہیں مجھے

جنگ جیتی ہے کیسے خوشبو سے
پھول حیرت سے دیکھتے ہیں مجھے

میں تو ان سے بھی پیار کرتا ہوں
جو حقارت سے دیکھتے ہیں مجھے

سارے تریاق پاس ہیں میرے
سانپ نفرت سے دیکھتے ہیں مجھے

بیعتِ لفظ جب سے کی میں نے
حرف عزت سے دیکھتے ہیں مجھے

میں تو صحرا کا رہنے والا ہوں
پیڑ قسمت سے دیکھتے ہیں مجھے

تیرا دیدار ان کی مزدوری
جو بھی محنت سے دیکھتے ہیں مجھے

جانے کب چشمِ نیلگوں برسے
اشک مدت سے دیکھتے ہیں مجھے

غزل

انتخا :محمد جاوید باجوہ

گلاب، خواب، دوا، زہر، جام، کیا کیا ہے؟
میں آ گیا ہوں، بتا انتظام کیا کیا ہے؟

فقیر، شاہ، قلندر، امام، کیا کیا ہے؟
تجھے پتہ نہیں تیرا غلام کیا کیا ہے؟

امیر شہر کے کچھ کاروبار یاد آئے
میں رات سوچ رہا تھا حرام کیا کیا ہے؟

میں تم کو دیکھ کر ہر بات بھول بیٹھا ہوں
تم ہی بتاؤ مجھے تم سے کام کیا کیا ہے؟

زمیں پر سات سمندر، سروں پر سات آکاش
میں کچھ نہیں ہوں مگر اہتمام کیا کیا ہے؟

غزل

انتخا ب: شکیل نواز
(سال دوم)

ہر کوئی دل کی ہتھیلی پہ ہے صحرا رکھے
کس کو سیراب کرے کسے پیاسا رکھے
عمر بھر کون نبھاتا ہے تعلق اتنا
اے میری جان کے دشمن تجھے اللہ رکھے
ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو نام بھی تجھ سا رکھے
دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے
ہنس نہ اتنا بھی فقیروں کے اکیلے پن پر
جا، خدا میری طرح تجھ کو بھی تنہا رکھے
یہ قناعت ہے اطاعت ہے کہ چاہت ہے فراز
ہم تو راضی ہیں وہ جس حال میں جیسا رکھے

غزل

انتخاب: آمنہ نور (ایم۔اے انگلش)

وہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

دیکھنے والا اک نہیں ملتا
آنکھ والے کثیر ہوتے ہیں

جن کو دولت حقیر لگتی ہے
اُف! وہ کتنے امیر ہوتے ہیں

جن کو قدرت نے حسن بخشا ہو
قدرتاً کچھ شریر ہوتے ہیں

زندگی کے حسن ترکش میں
کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

پھول دامن میں چند رکھ لیجیے
راستے میں فقیر ہوتے ہیں

اے 'عدم' احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں۔۔!!

غزل

انتخاب: رائے ذوالکیف احمد

نبض ہستی تیرے عشق کی گرمی سے جلا پائے
ذرّہ ذرّہ سے مستی میں آرِنی کی صدا آئے

اے حسن مجسم لن ترانی سے نہ جلووں کو دور رکھ
ہم تو وہ پروانے ہیں جو ہونے کو فدا آئے

جل کر میری راکھ بن جائے درد کا درماں
جس کو لیے خود چل کر مسیحا آئے

تیری زلف کے قیدی بھی عجب قیدی ہیں شاہ خوباں
کوئی چاہتا نہیں تیرے دامن سے رہا پائے

تیرے مست دیوانوں کا غیروں سے کیا کام
وہ تو ایسے ہیں کہ خود کو بھی بھلا آئے

دادا، ابا اور میں

ظفر گورکھپوری
انتخا : محمد یونس جنجوعہ (پرنسپل)

☆

دادا حیات تھے جب
مٹی کا ایک گھر تھا
چوروں کا کوئی کھٹکا
نا ڈاکوؤں کا ڈر تھا
کھاتے تھے روکھی سوکھی
سوتے تھے نیند گہری
شامیں بھری بھری تھیں
آباد تھی دوپہری
سنتوش تھا دلوں کو
ماتھوں پہ بل نہیں تھا
دل میں کپٹ نہیں تھی
آنکھوں میں چھل نہیں تھا

تھے لوگ بھولے بھالے
لیکن تھے پیار والے

☆

ابا کا وقت آیا
تعلیم گھر میں آئی
تعلیم ساتھ اپنے
اک انقلاب لائی
اونچا، روایتوں سے
اُٹھنے کا دھیان آیا
مٹی کا گھر ہٹا تو
پکا مکان آیا
دفتر کی نوکری تھی
تنخواہ کا تھا سہارا
مالک پہ تھا بھروسا
ہو جاتا تھا گزارا

پیسہ اگرچہ کم تھا
پھر بھی نہ کوئی غم تھا

☆

اب ہے مرا زمانہ
ہر بات ہے نرالی
گھر تو بھرا پڑا ہے
پر زندگی ہے کالی
اک بھاگ دوڑ ہر دم
جیون کا حال ایسا
اپنی خبر نہیں ہے
مایا کا جال ایسا
پیسہ ہے، مرتبہ ہے
جاہ و وقار بھی ہے
نوکر ہیں اور چاکر
بنگلہ ہے، کار بھی ہے

زر پاس ہے، زمیں ہے
لیکن سکوں نہیں ہے

غزل

انتخا :محمد طفیل ناصر(سپرنٹنڈنٹ)

احساس محبت کا میری ذات پہ رکھ دو
تم ایسا کرو ہاتھ میرے ہاتھ پہ رکھ دو ......

معلوم ہے، دھڑکن کا تقاضا بھی ہے لیکن
یہ بات کسی خاص ملاقات پہ رکھ دو ......

یوں پیار سے ملنا بھی مناسب نہیں لگتا
یہ خواب کا قصہ ہے اسے رات پہ رکھ دو ......

اظہار ضروری ہے تو پھر کہہ دو زباں سے
یہ دل کی کہانی ہے روایات پہ رکھ دو ......

یہ پیار کی خوشبو میں نیا رنگ بھرے گا
اک پھول اٹھا کر میرے جذبات پہ رکھ دو ......

ہر وقت تمہارے ہی تصور میں رہوں میں
جادو سا کوئی میرے خیالات پہ رکھ دو ......

اک میں کہ میرے شہر میں بارش نہیں ہوتی
اک تم کہ ملاقات کو برسات پہ رکھ دو......

مانوں گا سحرؔ تب ہی کہ جب بات بنے گی
اس بار میری جیت میری مات میں رکھ دو......

غزل

انتخا : محمد سلمان علی (لیکچرر اسسٹنٹ)

عشق ہو جاؤں ____، پیار ہو جاؤں
میں جو خوشبوئے ____ یار ہو جاؤں

جب بھی نکلوں میں ڈھونڈنے اس کو
دُھول، مٹی، ____ غبار ہو جاؤں

اُس کے وعدے ____ کا اعتبار کروں
پھر شب ____ انتظار ہو جاؤں

اوڑھ لوں اُس ____ کی یاد کی چادر
اور، خود پر ____ نثار ہو جاؤں

میں تِرا موسم ____ خزاں پہنوں
اور فصل ____ بہار ہو جاؤں

ایک شب اُس کو، اِس طرح دیکھوں
دامَن شب کے ____ پار ہو جاؤں

جو ہوا تجھ کو ____ چھو کے آئے میں
اُس کو چھو لوں ____، بہار ہو جاؤں

جس گھڑی بھی میں ____ آئنہ دیکھوں
اس گھڑی، ____ عکس یار ہوجاؤں

غزل

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

دو تیر نظر دے مار گئے — لنگھ سینے وچوں پار گئے

اک دل میں یار لئی رکھیا سی — اوہ دل وی لے سرکار گئے

دنیا دیاں راہاں اوکھیاں نیں — کئی رانجھے بازی ہار گئے

کجھ بازیاں انج وی جتیاں نیں — خود ڈُب کے یار توں تار گئے

اج تیریاں آساں لگیاں نیں — اساں بوہے تے سو بار گئے

جیون دے چار دہاڑے سن — دو آر گئے دو پار گئے

اودوں نکل میری جان گئی — جدوں ویڑے چوں دلدار گئے

سودا اے نقد و نقدی دا — پر دل تے جان ادھار گئے

کجھ تیرے ہجر وچ بل گئے ساں — کجھ لوکیں آکے ساڑ گئے

اج رُس کے ٹر پئے ساڈے ناں — سانوں جیندیاں قبر اتار گئے

تسی دل لٹیا تسی جاں لٹی — سب ساڈے چین قرار گئے

حالت اے نفسا نفسی دی — اک دوجے دے غم خوار گئے

نفرت نال سینے بھر گئے نیں — دنیا توں سبھے پیار گئے

جو ملیا دل نوں توڑ گیا — اٹھ دنیا توں اعتبار گئے

ایک ایک کر کے اس دنیا نوں — اج یونس دے سبھے یار گئے

غزل

بھیک صابر گدا

جیہڑے دن دا اکھیاں تکیاے منظر اکھ بلوری دا
اوسے دن دا مینوں جاپے اپنا آپ وی چوری دا
بھویں قوس قزع وچ بھاہ کے دیندار ہوئے جھوٹے کوئی
او سواد نہیں مڑ کے آوندا جیہڑا ماں دی لوری دا
وِنگیاں لیکاں مٹی بھریاں پیراں دے وچ سو سو چھالے
جگوں وکھرا ہار سنگھار اے دیس پنجاب دی گوری دا
بالاں سٹے چگ کے جیہڑی بوری بھر لیاندی اے
محلاں والیو چکو تے سہی جھٹ کو بھار اس بوری دا
بے پرواہ نے میریاں گلاں انج ولوندر چھڈیاں نیں
جسراں بھرے سمندر وچ پتاسے نوں نہیں کھوری دا
دھیاں کوٹھے جیڈیاں چھڈ کے حاجی صاحب اکھوائی دا نہیں
حج وی فرض اے بندے تے پر دھی نوں پہلاں ٹوری دا
یار گداؔ ہن چھیتی آ جا ساہ وی نیڑے لگ کے نیں
نالے دھاگا ٹُٹ چلا اے منتاں والی ڈوری دا

غزل

انتخا : مجد اسد (سابقہ طالب علم)

دیکھ لے سجناں میریاں گلاں ......
رب دے نال وی تیریاں گلاں ......
سب دے نال بس تیرا ای ذکر ......
جگ دے نال بس تیریاں گلاں ......
رات دا پہر تے کلیاں بیٹھے ......
یاد آندیاں نیں تیریاں گلاں ......
کول بے کے جے سنیں گلاں ......
کریئے فیر بتھیریاں گلاں ......
ہور کسے دیاں کی کریئے گلاں ......
ہون بس تیریاں تے میریاں گلاں ......
گلاں وچوں نکلیاں گلاں ......
اس طریقے نال اونے پھیریاں گلاں ......

نظم

انتخا : محمد امین آسی

وچھڑ گیا میرے دِل دا جانی
میں ککھاں وَانگر رُل گئی
پھلاں نالوں نازک جندڑی
وِچ کنڈیاں دے رُل گئی
غم سجناں دے مار مکایا
تے میں اَتھروں بن کے ڈُل گئی
اِک ماہیا تیری یاد نہ بھُلدی
باقی ہر شے جگ دی بھُل گئی

☆......☆

غزل

انتخا : تنویر احمد، سینئر لیکچرار اسسٹنٹ

اسیں بُجھیاں سب بجھار تاں سانوں ھور نہ ایویں چھل
ساڈا خون ھجر نچوڑ دا ساڈے مسئلے دا نئیں حل

ساڈے اندروں گونج نہ جاندی ساڈی رَگ رَگ وَجدے ٹَل
اسیں عشق نبھاون ٹر پئے ساڈی جیوندیاں لے گئی کھل

ساڈے پیر لھولھان سانُوں یار پیا آکھے چَل
ساڈی منزل اوکھی بیلیا تُو ساڈے نال نہ رَل

غزل

انتخا : پروفیسر مشرف الرحمٰن نذیر

غصے وچ نہ آیا کر
ٹھنڈا کر کے کھایا کر

دن تیرے وی پھر جاون گے
اینویں نہ گھبرایا کر

ڈھڈ دا بالن لے کے توں
دن ڈلے گھر جایا کر

پیار دے ایسے بوٹے لا
سارے پنڈ تے سایہ کر

اپنے اندروں جھوٹ مکا
سچ دا ڈھول وجایا کر

رکھی سکھی کھا کے توں
سجدے وچ ٹر جایا کر

من اندر توں جھاڑو دے
اندر باہر صفایا کر

نہ کر جھولی دنیا اگے
رب اگے کر لایا کر

☆......☆